مخصوص کارڈ سے

مصنف :- اکمل جالندھری

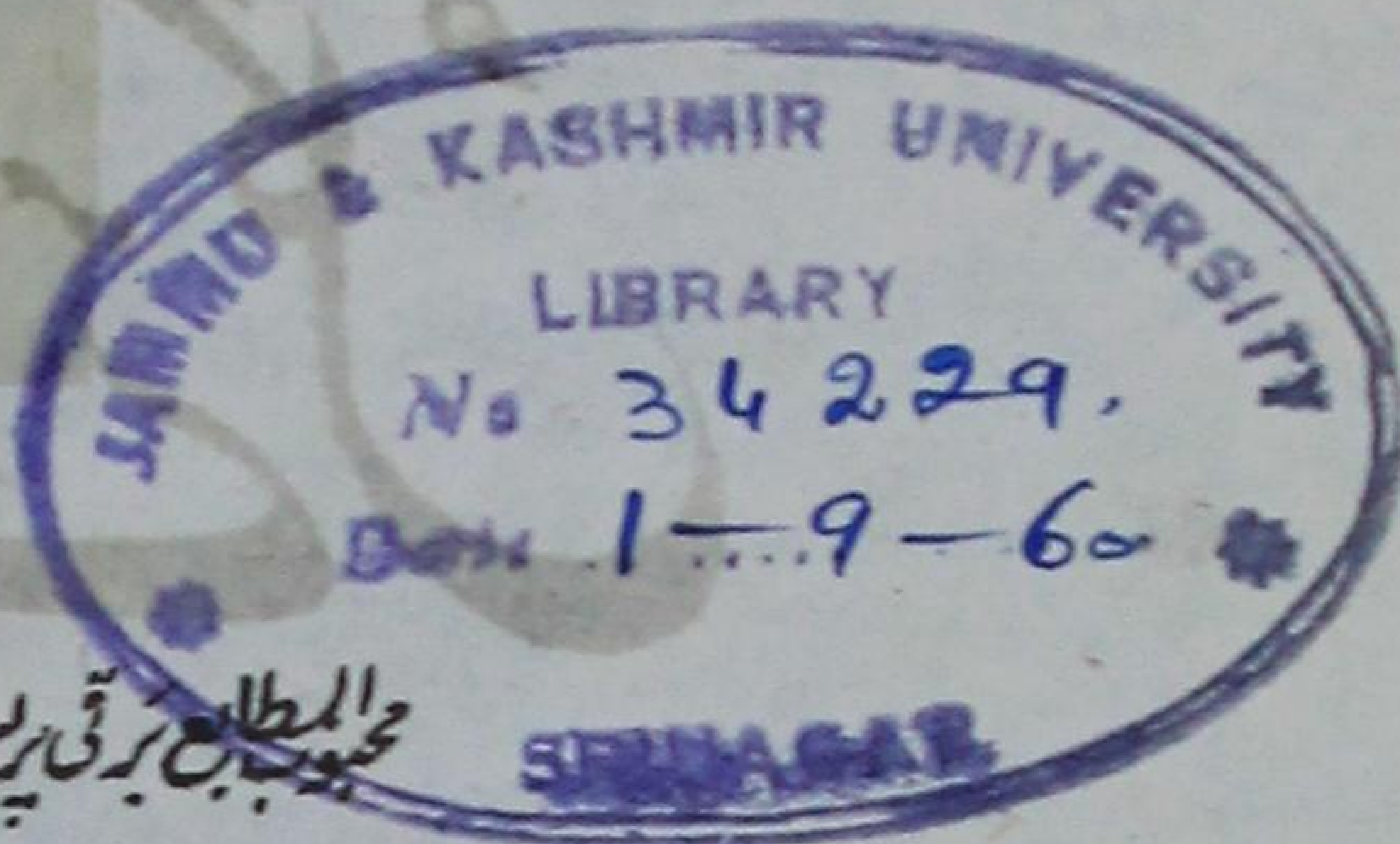
عنوان :-

ترتیب :-

اردو شاعری







محبوب المطابع برقی پریس دہلی

قیمت ڈھائی روپے

تعداد ۱۰۰۰ بارِ اوّل

مکتبہ دارالنشاط - بازار سیتارام دہلی

کتبہ زیدی ۵۶ء

پیش کلام

(از حضرت احسان دانش - لاہور. پاکستان)

ادب کا ایک دور جب آہستہ آہستہ دوسرے دور میں داخل ہوتا ہے تو شروع شروع میں
اس کے نقش و نگار نہیں بدلتے بلکہ لباس میں قطع برید ہوتی ہے جس سے کہیں تو حجاب ہوتا ہے
اور کہیں منہ زور دیدہ دلیری کیونکہ شاعر اور ادیب کے لئے روایات اور رجحانات کا بدلنا مذہب
بدلنے سے کسی طرح بھی کم نہیں رجحانات کو انسان کبھی تقلید میں نہیں بدلتا اور نہ عقل سلیم اس کی
اجازت دیتی ہے۔ یہ تو رفتہ رفتہ جب ماضی پر حال کی شعاعیں پڑتی ہیں اور ہر چیز اپنے خدوخال کو
اُجاگر کرتی ہے تو انسانی دنیا میں سب سے پہلے شاعر ہی اس سے متاثر ہوتا ہے۔

ادب کی آہ و بکا اور شاعری کی نغمہ زنانی سے مذہبی سانچوں کی ساخت بدلنے لگتی ہے اور
مذہب کو برباد دیکھ کر سیاسی لوگ وقت کی رفتار میں جھنکار پیدا کر کے عوام کو ماحول کے اعتراف
پر مجبور کرتے ہیں۔

اس عمل سے کہیں تو سلطنتوں کے ستون ٹوٹتے ہیں اور کہیں عقائد میں دراڑیں کھلتی ہیں کہیں
اخلاق ناک بھوں چڑھاتا ہے اور کہیں روایات بسورتی دکھائی دیتی ہیں لیکن وقت کے
پہیئے کو کون روکے اور ماحول کے تقاضوں کو کون زنجیر پہنا سکتا ہے۔ ارتقائے کائنات
اپنے زریں رتھ لئے بلندیوں پر چڑھتا جاتا ہے اور نظر بھر کر دیکھا جائے تو ماضی میں گرد و غبار
کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اور ہر شعبہ حیات میں یہ ارتقائی طلسم کاری ہمیشہ سے یونہی چلی آئی ہے
اور اسی طرح چلتی رہے گی۔ لیکن یہ مسلم امر ہے کہ ارتقا کی آہٹ اور انقلابات کے سانسوں
کی گرمی کو سب سے پہلے شاعر اور صرف شاعر محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ شاعر کی روح مادی دنیا میں
زیادہ لت پت نہیں ہوتی۔ اس کا رشتہ غیر مادی لطافتوں سے گہرا اور مضبوط ہوتا ہے۔ یہی اسباب

ہیں کہ فطرت اپنے ارادوں کے پرتَو سب سے پہلے شاعر کے دل پر ڈالتی ہے اور شاعر کا دل ہی احساس کو
الفاظ کا جامہ دیتا ہے۔

ہمارا موجودہ دَورِ ادب بھی ایک اجنبی راستے پر گامزن ہے جو اپنے ماضی کے مقام کو تو چھوڑ
چکا لیکن مستقبل کی منزل پر ابھی نہیں پہنچا۔ اس لئے ابھی اس میں کہیں روایات ہیں اور کہیں عقائد
کہیں آزاد خیالی ہے اور کہیں لرزتی ہوئی جرأتیں کیونکہ قدیم عقائد اور خیالات تو پہلے زینے پر رہ
گئے اور جدید تصوراتِ حیات بلندی اور دوری کے باعث صاف صاف نظر نہیں آتے لیکن
مطالعۂ ادب سے انسانی اذہان کی رفتار اور زبان و بیان کے ٹکسال کی صنعتیں بتا رہی
ہیں کہ یہ قافلہ بہت جلد جلد منزلیں مار رہا ہے اور وہ دن دُور نہیں کہ انسانی ترقی چاند تاروں
کو طے کر کے نئے آسمان دریافت کرے یا آفتاب و ماہتاب کے کارخانے قائم کرے۔

اسی دَور کے ایک شاعر جناب اکمل جالندھری کے کچھ اشعار میرے پیشِ نظر ہیں جن میں سب
وہی باتیں ہیں جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ اُن کے کلام میں دلکشی کے ساتھ ساتھ اُن کے اُن
جدید رجحانات کا پتہ بھی چلتا ہے جو ہر صاحبِ احساس انسان کو وقت عطا کرتا ہے اور احسا…
ہی جان ہوتا ہے شاعری کی، رہا الفاظ کا معاملہ وہ تو لباس ہے جو موسموں کے ساتھ حریری او…
دبیز ہوتا رہتا ہے۔ اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس کی کاٹ تراش ادلتی بدلتی رہتی ہ…

کہنا مجھے صرف یہ ہے کہ اکمل جالندھری کی شاعری میں وہ شئے لطیف بدرجہ اتم موجود ہے۔ ج…
جوہر کہلاتا ہے اور اس کے بعد کا سب ساز و سامان تحصیل کی چیز ہے جتنا مطالعہ بڑھتا جا…
ہے۔ اسی قدر کلام میں قدرت کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

میں اکمل صاحب سے متعارف نہیں لیکن ان کے اشعار مجھے مجبور کرتے ہیں کہ دہلی جا…
ہو تو انہیں دیکھوں تاکہ نقاش کی ملاقات کے ساتھ اس کے فن میں کام آنے والے رنگ او…
قلم نظر سے گزر جائیں اور ماحول سے اس کے پس منظر کا اندازہ بھی لگ جائے جس سے فنکار…
فن خود سے بولنے لگتا ہے۔

اور تجزیہ کرنے کا وقت یہی ہے ورنہ مصور کے ساتھ جب اس کا فن بلوغ کو پہنچ جا…
ہے تو اس کے رنگوں کی آمیزش سے ہر رنگ کو الگ الگ کر کے جدا اتصال لگانا شاید ا…

انسان کے بس کی بات نہیں۔

ابتدا میں اگر رجحانات کو پرکھ لیا جائے تو انھیں بنیادوں پر بڑی بڑی تعمیروں کا تجزیہ بھی دشوار نہیں ہوتا۔

میری دعا ہے کہ اکمل جالندھری کو زمانہ کسی ایسی گرفت میں نہ لے کہ ان کے راستے ریت سے اٹ جائیں یا اس قدر چھوٹ نہ دیدے کہ اپنی حدود سے نکل کر بھٹک جائیں۔ اور بس۔

احسان دانش

بُوئے گُل

پروفیسر تلوک چند محروم کی نظر میں

حضرت اکمل جالندھری کے نام اور کلام سے (قبل از تقسیم ہند) مجھے سرسری واقفیت تھی تقسیم کے بعد جب میرا مستقل قیام دہلی میں ہوا تو اکثر مشاعروں میں ان کی زبان سے ان کے اشعار سُنے اور یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ وہ سامعین سے دادِ سخن حاصل کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔ کیوں نہ ہو آپ اُس شاعر خیز خطّہ سے اُٹھے ہیں جس نے گرامی اور حفیظ جیسے باکمال سخنور پیدا کئے ہیں۔ میری مراد جالندھر سے ہے جس کے قریب بیٹھے ہوئے حضرت جوش ملسیانی آج بھی اپنی شہرت کا ڈنکا بجا رہے ہیں۔

یہ تمہید اس تقریظ کی ہے جس کی فرمائش اکمل صاحب نے مجھ سے کی ہے۔ انھوں نے اپنا مجموعہ کلام اشاعت کے لئے مرتب کیا ہے اور اس کا نام "بوئے گُل" رکھا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ میں اس کا تعارف لکھوں اگرچہ اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ "بوئے گُل" نام ہی ایسا ہے جس پر یہ مقولہ صادق آتا ہے۔

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطّار بگوید

لیکن ان کی خواہش کی تکمیل میرے لئے خوشی کا باعث ہے۔

یہ مجموعۂ نظم گلہائے رنگارنگ کا گلدستہ ہے جس میں غزلیں، نظمیں، رباعیاں، قطعے اپنی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ غزلیات میں ہر قسم کے مضامین مثلاً عاشقانہ، صوفیانہ، حکیمانہ، ناصحانہ اپنی شاعرانہ رعنائی کے ساتھ نظر افروز ہیں۔ جو بات کہی گئی ہے، بڑے رکھ رکھاؤ اور سلیقے سے۔ طرز بیان غزل کی زبان اور مزاج کے عین مطابق ہے۔ بے جا تکلّف اور تصنع یا اغراق و غلوے

احتراز کیا گیا ہے۔ سوز و گداز اور تاثیر کی بھی کمی نہیں۔

اُردو شاعری کے باوا آدم ولی سے لے کر آج تک یہی تسلیم کیا جاتا ہے کہ غزل کی خوبصورتی بلکہ زندگی ہی جذباتِ حسن و عشق پر قائم ہے۔ اس لئے صوفیائے کرام نے بھی حسنِ ازل کے ساتھ بھی زلف و رخسار کی قید لگا کر اپنے جذباتِ عشق کا اظہار کیا ہے۔ ہمارے اپنے وقت میں "غمِ دوراں" کا پرچار کرنے والے شعرا بھی عام طور پر غزل میں اپنے محسوسات کو غمِ جاناں کا لباس پہناتے ہیں یا استعارات کے پردے میں ایسے ہی لطیف اور نرم و نازک الفاظ لاتے ہیں جو غزل کی روایتی لطافت اور نزاکت پر بار نہ ہوں۔ اس نظریئے کے پیشِ نظر اکمل صاحب کی غزلیات معیاری معلوم ہوتی ہیں۔ ہر غزل جذباتِ عالیہ کی حامل ہے اور عامیانہ پن سے کلیتہً پاک۔ شاعر کی طبیعت کی افتاد ہی ایسی معلوم ہوتی ہے کہ ظاہری عشق کے اظہار میں بھی متانت اور تہذیب پر نظر رہتی ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار پر نظر ڈالیے۔

کہیں کس سے غمِ اُلفت کے مارے غم کا افسانہ
زمانہ دور رہتا ہے غمِ اُلفت کے ماروں سے

کتنے سادہ الفاظ میں غمِ اُلفت کی مجبوری بیان کر دی ہے۔ شعر کیا ہے درد کی تصویر ہے۔

جمال انگڑائیاں لینے لگا ہے
ہمارا دل ہمارا اور کب تک

عروجِ حسن اور عاشق کے دل کی والہانہ دارفتگی کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

بجز اس کے کیا ہیں یہ اشک اور آہیں
وہ آنکھوں کا قصہ، یہ غم کی کہانی

ایک اچھوتا مضمون نظر آتا ہے۔ غالباً کسی نے اب تک آنسوؤں کو آنکھوں کا قصہ اور آہوں کو غم کی کہانی نہیں کہا۔

دوش پر بکھری ہوئی زلفِ پریشاں دیکھئے
پھر ہوئے میری پریشانی کے ساماں دیکھئے

عاشقانہ شاعری میں یہ شعر اپنا مقام رکھتا ہے۔ معشوق کی زلفِ پریشاں اور عاشق کی پریشانی لازم و ملزوم چلی آتی ہیں۔ مضمون پرانا سہی لیکن طرزِ بیان کی شگفتگی اور سلاست نے اسے تازہ کر دیا ہے۔

اس قبیل کے اشعار کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ کثرت ایسے مضامین کی ہے جو خالص صوفیانہ ہیں یا صوفیانہ جذبات کی بلندی کو چھو رہے ہیں۔ طوالت کے خوف سے صرف چند مثالیں

پیش کی جاتی ہیں۔

یہ مانا نغمہ زن ہو تم مرے سازِ تصور میں — مگر سازِ تصور کا بھی پردہ درمیاں کیوں ہو

جس کو تیرے نام سے ہے عشق دنیا میں اُسے — کوئی غم ہوتا نہیں، کوئی خوشی ہوتی نہیں

بعدِ نظارہ بھی ہوں وہی تشنہ کامِ دید — آئے نظر مگر نظر آئے کہاں مجھے

کبھی درد بن کر، کبھی نور بن کر — وہ دل میں سمائے، نظر میں سمائے

میں ناشناسِ عظمتِ دیر و حرم نہیں — نسبت انھیں مگر ہے ترے سنگِ در سے کیا

تجھ کو دھوکا ہے یہ اے شیخِ حرم — وہ کہاں تجھ کو جہاں معلوم ہے

جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں غزلیات میں حکیمانہ، اور ناصحانہ مضامین کی بھی کمی نہیں مثلاً

اکمل کسی کو تو نہ جہاں میں برا سمجھ — تجھ کو برا جو سمجھے تو سمجھا کرے کوئی

ہر دور ہے دنیا کے لئے دورِ مصیبت — کس دور میں انسان پریشاں نہیں ہوتا

عالم کن آفتوں کا مرقع ہے کچھ نہ پوچھ — آنا پڑے خدا نہ کرے پھر یہاں مجھے

ہے بے سود و ناحق تلاشِ گلستاں — جہاں آشیاں ہے وہیں گلستاں ہے

اگرچہ اکمل صاحب کا کلام اُس دور کی ذیل میں نہیں آتا۔ جسے "ترقی پسند" کا نام دیا جاتا ہے لیکن زمانہ کی روش کے مطابق ان کی غزلیات میں "غمِ دوراں" بھی شامل ہو گیا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔ ؎

ہر سمت ہے تلاطمِ بحرِ غمِ جہاں — کیوں کر غمِ جہاں سے کنارا کرے کوئی

"غمِ جہاں" سے متاثر ہو کر غریب مزدور اور عیش پرست سرمایہ دار کا تقابل کس خوبی سے پیش کیا ہے ؎

کیا؟ کوئی جہاں میں ہو مستِ مئے نشاط — حسرت بھری نگاہ سے دیکھا کرے کوئی

منظومات، قطعات اور رباعیات کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔ رباعی کیلئے طویل مشقِ سخن اور کاوشِ فکر درکار ہوتی ہے سو اکمل صاحب اس میں بھی کامیاب ہوئے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ان کا یہ مجموعۂ کلام قبولِ عام کا مستحق ٹھیرے گا۔

دہلی

۲ر فروری ۵۶ء

تلوک چند محروم

"بوئے گل" میری نگاہ میں

(بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی)

اکمل صاحب کا کلام جتنی مرتبہ میں نے ان کی زبانی سنا مجھے بالکل ایسا محسوس ہوا کہ ایک نرم و نازک پنکھڑیوں والے پھول کی خوشبو سے دل و دماغ کو فرحت مل رہی ہے اس لئے جب ان کے کلام کی اشاعت کا سوال پیش ہوا تو لازماً یہ بھی معاملہ زیر غور رہا کہ اس کا نام کیا رکھا جائے۔ جب مجھ سے اس بارے میں مشورہ ہوا تو میں نے اس کا نام 'مہکیں' تجویز کیا۔ پہلے تو اکمل صاحب کو بھی یہ نام پسند آگیا لیکن جب دوبارہ انھوں نے اس کا نام "بوئے گل" تجویز کیا تو مجھے یہ نام 'مہکیں' کے بمقابلہ زیادہ پسند آیا۔ چنانچہ اکمل صاحب کا یہ مجموعہ کلام "بوئے گل" کے نام سے دنیائے ادب میں پیش ہو رہا ہے۔ اس نام سے میرے ذہنی احساسات کی بھی تکمیل ہوتی ہے اور اکمل صاحب کے مذاق کی ترجمانی بھی۔

اکمل صاحب موجودہ دور کے خوش گو شاعروں میں ہیں وہ نظم بھی کہتے ہیں اور غزل بھی۔ انھوں نے رباعیاں بھی کہی ہیں۔ ان تینوں اصناف میں ان کا جو کچھ کلام محفوظ ہے۔ اس مجموعہ میں شامل کیا گیا ہے۔ اکمل کی خوش گوئی جب ان کی خوشنوائی کے ساتھ منظر عام پر آتی ہے تو ذہن و دماغ دونوں کی تسکین کا سامان اپنے ساتھ لاتی ہے۔

میرا خیال تھا کہ اکمل محض غزل گو شاعر ہیں لیکن جب میں نے ان کی نظمیں دیکھیں تو انھیں غزل اور نظم دونوں میں دل رکھنے والا شاعر پایا۔

میں نے نہایت بے لوثی کے ساتھ اکمل صاحب کے کلام پر نظر ڈالی ہے۔ یہ تو بالکل درست ہے کہ اکمل کو غزل سے طبعی جو مناسبت ہے اس کا پورا اثر ان کی غزل پر ہے۔ ان کی غزل میں بھی حسن و عشق اور بادہ و ساغر کی شاعری ہے لیکن اکمل کو حسن و عشق کے حوالے میں کبھی کسی مرحلے

سے گزرنا پڑا ہو اس کا مجھے اندازہ نہیں۔ ان کی شاعری میں اگر بادہ و ساغر کا ذکر ہے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ وہ اس معاملے میں مرحوم شراب خوار جگر یا پاکستان چلے جانے والے جوش اور مشاعروں میں ہوش و حواس سے گزر جانے والے فراق ہیں۔ اس لئے ان رندانہ اشعار پر بھی مرزا غالب کا وہی شعر صادق آتا ہے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

کہنے والے کہتے ہیں کہ اکمل کی غزل بھی دوسرے بیشتر شاعروں کی طرح روایتی غزل ہے اس مشترک عنصر کو خارج کرنے کے بعد ہمیں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اکمل نے جو کچھ کہا وہ سلیقہ شعرگوئی پر کہاں تک پورا اترتا ہے اور اس کا اثر سننے والوں کی طبیعت پر کیا پڑتا ہے۔ ان کی غزلوں کے مندرجہ ذیل منتخب اشعار سے معلوم ہوگا کہ اکمل کو شعر کہنے کا سلیقہ ہے وہ جو کچھ کہتے ہیں۔ صاف ہوتا ہے اس کو سمجھنے کے لئے سننے والے کو دماغ سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے شعر لوگ سنتے ہیں اور ان کا اثر دلوں پر لیتے ہیں۔

آپ دورِ موجودہ کے کسی اچھے اور مقبولِ عام شاعر کی غزلوں سے ان کی غزلوں کا مقابلہ کریں گے تو ان کو کسی دوسرے ہم عمر اور ہم عصر سے کمتر نہیں محسوس کریں گے۔ یوں بھی کسی کا مقولہ ہے "قبولِ خاطر و رنگِ سخن خدا داد است" بعض غزلوں میں روایتی انداز ہونے کے باوجود اچھے شعر نکالے ہیں۔

ہاتھ ہے چاکِ گریباں پہ نظر سوئے فلک
آج کیا جانئے کیا عزم ہے دیوانے کا

ہائے وہ میتِ بیکس جو اٹھائی نہ گئی
ہائے وہ سوز جو اک راز تھا پروانے کا

انگلیاں جیب و گریباں سے الجھ جاتی ہیں
راز افشا کہیں ہو جائے نہ دیوانے کا

اکمل کے یہاں بھی تغزل کے بمقابلہ تصوف زیادہ ملتا ہے۔ کہتے ہیں۔

طریقِ عشق میں یہ کون سا یا رب مقام آیا
مرا ہی دل مقابل صورتِ حسنِ تمام آیا

یہ مطلع بھی خوب ہے۔

کچھ ایسا آج ساقی کی نگاہوں سے پیام آیا
ہے کس کافر کو اتنا ہوش کب گردش میں جام آیا

زبان کا لطف اس غزل کے اشعار میں ہے۔

ہے ہر چند بیگانہ وہ ہم سے بزمِ دشمن میں　　مگر نظروں ہی نظروں میں پیام آیا سلام آیا

معلوم ہوتا ہے کہ ناسازگاری ماحول نے اکمل کے نقوشِ سخن کو زیادہ اُبھرنے نہیں دیا. اس کا اعتراف ان کو خود بھی ہے۔

کٹی ہے اپنی ساری عمر اکمل نامرادی میں　　ہمیں کب سازگار اس بزمِ دوراں کا نظام آیا

اکمل صاحب جو کچھ کہتے ہیں. مختصر کہتے ہیں اور اس میں شیرینی ہوتی ہے۔ ان کے پڑھنے کا انداز بھی بہت دل کش ہے۔ آواز میں مردانہ مٹھاس ہے اور غزلوں میں زبان زیادہ صاف ہے

آخر کوئی حد بھی ہے ترے جور و جفا کی　　کب تک یہ ستم اے ستم ایجاد رہے گا

غم نام ہے جس کا وہ نشانی ہے طلب کی　　آزادِ طلب جو ہے وہ آزاد رہے گا

گو لاکھ مخالف ہوں زمانے کی ہوائیں　　آزاد طبیعت ہے جو آزاد رہے گا

اور بعض اشعار کا تغزل بھی قابلِ داد ہے۔

وہ پہلے پہل دل کا نگاہوں سے تصادم　　یہ سانحہ تا حشر مجھے یاد رہے گا

غیر ملکی حکومت کے جور و استبداد سے آزاد ہونے کیلئے ملک میں جو اُمید و حوصلہ سے بھری ہوئی کشمکش عرصۂ دراز سے جاری تھی۔ اس کے متوقع نتائج کے مدِنظر اکمل کا یہ شعر ایک تاریخی ماحول کا غماز ہے۔

مانا کہ ہیں چلنے کو سکوں بخش ہوائیں　　یہ دَور زمانے کو مگر یاد رہے گا

اکمل پر نام نہاد ترقی پسند رجحانات کا اثر کم ہے اور وہ بھی میری طرح خدا یا کسی بالائی طاقت کے قائل ہیں اور اس کے ذکر و فکر میں زندگی کے چند لمحات گذارتے بھی ہیں۔ ورنہ وہ یہ نہ کہتے کہ

ہے قول کسی مردِ حق آگاہ کا اکمل　　پہلو میں جو دل ہے تو خدا یاد رہے گا

اکمل کے پہلو میں عاشقانہ دل ضرور ہے وہ میری طرح زاہدِ خشک بھی نہیں. محبت کی لذتیں انھیں معلوم ہیں جبھی تو کہتے ہیں کہ ؎

زباں خاموش ہوتی ہے نظر سے کام ہوتا ہے　　اسی ماحول کا شاید محبت نام ہوتا ہے

تصور اور نظارے کے درمیان بھی خوب امتیازی تصویر کھینچی ہے۔

تصور اور نظارے میں ہے بس امتیاز اتنا　　وہ منظر خاص ہوتا ہے یہ منظر عام ہوتا ہے

دو تین اشعار ایک غزل کے داد طلب ہیں۔

کُھلا ہے میکدۂ عشق اور ہر میکش
بقدرِ ذوقِ طلب فیضیاب ہوتا ہے

وہ بے نقاب تو ہونے کے واسطے ہو جائے
مگر نظامِ دو عالم خراب ہوتا ہے

طریقِ عشق کی منزل کٹھن ہزار سہی
سفر اسی کا ہمگر کامیاب ہوتا ہے

اور قدرت کی مصلحتوں پہ یہ طنز بھی خوب ہے۔

کہیں نگاہِ کرم بھول کر نہیں ہوتی
کہیں کرم پہ کرم بے حساب ہوتا ہے

اکمل کی بوئے گل میں اور بھی ایسے اشعار ہیں جن سے مشامِ جاں کو طراوت حاصل ہوتی ہے۔

ہم میکشوں کو حاصلِ جم ہے بس ایک جام
حاصل ہی کچھ سلطنتِ بحر و بر سے کیا

شوقِ چمن اگر ہو قفس لے اڑیں اسیر
یہ کیا کہا کہ فائدہ ہی بال و پر سے کیا

اُٹھتے ہیں شعلے پھر سے قلب و جگر سے کیوں
پھر واسطہ پڑا کسی برقِ نظر سے کیا

قیدِ قفس میں بھی میں آباد تھا چمن میں
جب تک مری نظر میں عالم بہار کا تھا

یوں کہیئے بات رکھ لی داغِ جگر نے ورنہ
یہ زندگی بھی کیا تھی بجھتا سا اک دیا تھا

اس زمین میں یہ شعر حسنِ تقابل کے لحاظ سے زیادہ توجہ کا مستحق معلوم ہوتا ہے۔

رودادِ دل کو ان کی نظریں سمجھ رہی تھیں
نظریں جو کہہ رہی تھیں وہ دل سمجھ رہا تھا

یہ اشعار بھی قابلِ داد ہیں۔

اکمل ترے حالات کو کیونکر کوئی سمجھے
چہرے سے ترے غم بھی نمایاں نہیں ہوتا

حقیقت میں یہ دیوانے بڑے ہشیار ہوتے ہیں
پہنچ جاتے ہیں منزل پر جو پہلے ہوشیاروں سے

غمِ عشق میں کون کام آ رہا ہے
جو کام آ رہا ہے تو جام آ رہا ہے

نظر ہو رہی ہے نظر کے مقابل
سلام آ رہا ہے پیام آ رہا ہے

جمال انگڑائیاں لینے لگا ہے
ہمارا دل ہمارا اور کب تک

ایک مشکل زمین میں اچھے شعر نکالے ہیں۔

نوازشِ نگہِ فتنہ گر ہوئی تو ہے
کہ اپنی بزمِ سکوں منتشر ہوئی تو ہے

ارادتاً نہ سہی تو باتفاق سہی
مگر ادھر بھی کسی کی نظر ہوئی تو ہے

نگاہِ لطف جو ہم پر نہیں ہوئی تو کیا
نگاہِ خاص برنگِ دگر ہوئی تو ہے

زمانہ ہو مری رودادِ غم سے آشنا کیونکر
جو سب مجھ سے ہوں دیوانے تو یہ ری داستاں سمجھیں

کچھ ایسے بھی تو ہیں بیگانگانِ رنگ و بوئے گل
جو اپنے گلستاں کو بھی نہ اپنا گلستاں سمجھیں

کوئی تم سا جہاں میں اور نہیں
ہم نے سارے جہاں کو دیکھ لیا

ہائے مجبوریاں اسیروں کی
دور سے آشیاں کو دیکھ لیا

اس شعر میں اُن حسرت زدہ مسلمانوں کے قلبی تاثرات کی تصویر کھینچی گئی ہے جن کو مجبوراً قرول باغ سے منتقل ہونا پڑا تھا اور جو فوجی ٹرکوں میں سوار ہوتے وقت اپنے اپنے مکانوں کو حسرت کے ساتھ دیکھتے اور سرد آہیں بھرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ اس نظارے کو دیکھ کر انھوں نے یہ شعر بے ساختہ کہا تھا۔

یہ اشعار قابلِ داد ہیں۔

کیوں نہ اس کی دھڑکنوں میں ہو پیامِ زندگی
دل ہی تو ہے خاص پردہ زندگی کے ساز کا

کیا اسی تکمیل کا ہے نام تکمیلِ جنوں
جب صدائے دل پہ دھوکا ہو تری آواز کا

وہ سوزِ غم نہیں چھپ جائے جو چھپانے سے
یہ اور بات ہے ہم مسکرائے جاتے ہیں

مجھ کو ہر دم خیال ہے اُس کا
جس کو میرا کوئی خیال نہیں

دل کی مجبوریاں خدا رکھے
اب کسی بات کا ملال نہیں

زندگی خواب ہے محبت کا
اس کے آگے کوئی خیال نہیں

آئینہ دل کا ہے وہی لیکن
اب نہ وہ پہلی سی دیکھ بھال نہیں

وہ اور منتظرِ دید یوں ہمیں رکھیں
سمجھ لیا کہ ہمیں محوِ انتظار نہیں

کرم نہیں نہ سہی میں کرم سے درگزرا
یہ کیا ستم یہ بھی مائل ستم شعار نہیں

وہی اپنا نہیں بنتا جہاں میں
جسے اپنا بنانا چاہتا ہے دل

یہ مانا نغمہ زن ہو تم مرے سازِ تصور میں
مگر سازِ تصور کا بھی پردہ درمیاں کیوں ہو

طریقِ عشق میں جب سرفروشی شرطِ اول ہے
تو پھر عشاق کا منزل بمنزل امتحاں کیوں ہو

جلوۂ حسنِ دوست سے تابشِ مہر و ماہ ماند
جلوۂ دوست کے حضور تابشِ مہر و ماہ کیا

کوئی علم بھی نہ ہوگا۔ مگر ہیڈ بیگ کے ساتھ یہ کلام بھی ہمیشہ کے لئے اکمل صاحب سے جدا ہو گیا۔
لکھنؤ میں اکمل صاحب کو دو اور اچھے شاعروں کی صحبت بھی میسّر آئی۔ وہ ہیں میرے قدیم دوست پنڈت پیارے لال آنند اور دوسرے ستیہ دیو جی راٹھور صابر۔ ان دونوں کی صحبت سے بھی اکمل صاحب کی توجہ شعر گوئی کی طرف زیادہ ہوئی۔ مگر پنڈت دیوی چند کامل لکھنوی تو اکمل صاحب کے خاص مخلص احباب میں سے تھے جنکی بے وقت موت نے جو کہ ۱۹۴۱ء میں واقع ہوئی اکمل صاحب کو شدید صدمہ پہنچایا۔

اکمل مشاعروں میں شرکت ۲۵-۱۹۲۴ء سے کر رہے ہیں۔ میں نے پہلی مرتبہ غالباً ۱۹۲۹ء میں غازی آباد کے ایک مشاعرے میں انھیں سُنا تھا۔ چونکہ مرحوم نہال سیوہاروی بھی اکمل کے ساتھ ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے اور دونوں میں بہت زیادہ ربط وضبط تھا اسی لئے مدت تک میرا یہ خیال رہا کہ اکمل نہال سیوہاروی سے تلمذ رکھتے ہیں لیکن میرے اس خیال کی تردید اکمل کی زبانی اُس وقت ہوئی جب میں یہ سطور قلم بند کرنے کے لئے تیار ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں غریب نہال سیوہاروی کو مسلم لیگی ذہنیت کے سرکاری ملازموں نے جو اُن کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ زبردستی سنگسار کرکے پاکستان جانے پر مجبور کر دیا تو اکمل صاحب کو ایک معصوم اور بے لوث شاعر کے فراق کا صدمہ سہنا پڑا۔ نہال میرے بھی محبوب دوستوں میں تھے۔ اس لئے پہلے ان کا پاکستان جانا اور اس کے بعد ان کا پاکستان ہی میں غریب الوطنی کے صدمے موت کا شکار ہو جانا بہت کھلا۔ مجھے ان کی جدائی اور موت نے اکثر آبدیدہ کیا اور اب تک ان کی یاد مجھے کبھی کبھی ستانے لگتی ہے۔

اوپر کہہ چکا ہوں کہ اکمل غزل اور نظم دونوں میں دل رکھنے والا شاعر ہے۔ اگر میں ان کی نظموں کے منتخب نمونے پیش کروں تو مقالہ اور زیادہ طویل ہو جائیگا۔ مگر آپ دیکھیں گے کہ اکمل نے ہر موضوع پر شاعری کی ہے۔ اکمل کے پہلو میں وطن کا درد بھی ہے اور اپنی قدیم تہذیب و تمدن نیز دھرم اور مذہب سے بھی ان کو لگاؤ ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اکمل شعر گوئی کے معاملہ میں وقت کے تقاضوں کا بھی لحاظ رکھتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کی ناچاقی اور اس کے بعد اس ناچاقی کے باعث ملک کی تقسیم کا اثر ان کے دل پر بھی پڑا۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے کشت و خون کے ان واقعات کا مشاہدہ کیا ہے۔ جو ۱۹۴۷ء میں پیش آئے تھے۔ اسی لئے اس موضوع پر اُن

دیدہ و دل اگر نہیں جلوہ گہہ بہارِ حسن
اور بہارِ حسن کی ہے کوئی جلوہ گاہ کیا؟
بعدِ نظارہ بھی ہوں وہی تشنہ کامِ دید
آئے نظر مگر نظر آئے کہاں مجھے
میں سنے کئے ہیں دیدہ و حرم کے مشاہدات
معلوم ہے حقیقتِ رازِ نہاں مجھے

اکمل کو شعر کہتے ہوئے تقریباً ۳۰ سال سے زیادہ عرصہ گزرا۔ خاندان اور نسلی اعتبار سے تو شعر گوئی کے معاملے میں انھیں کوئی ورثہ نہیں ملا۔ مگر قدرت نے یہ مادّہ ازلی طور پر انھیں ودیعت کیا تھا۔ اس مادے کو اُبھرنے کی ترغیب اُس زمانے میں ہوئی۔ جب اکمل پنجاب کے قصبہ کھنہ میں میرے مرحوم دوست اور پنڈت مدن موہن مالوی کے خاص منظورِ نظر شاعر درویش صفت پنڈت یوگراج نظر سوہانوی کی صحبت میں بیٹھنے اُٹھنے کا موقع ملا۔ پنڈت نظر اسکول میں اُردو فارسی پڑھاتے تھے۔ یہ سنہ ۱۹۱۸۔۱۹ء کا زمانہ تھا۔ اکمل صاحب کا سالِ پیدائش سنہ ۱۹۰۷ء ہے وہ اسی قصبہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد پنڈت بھگت رام لکشمی جننگ فیکٹری کھنہ میں ملازم تھے۔ گویا اکمل کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ بارہ تیرہ سال کے تھے۔ ان کے ہم درس پنڈت دیوی چند کامل۔ روڑا رام صادق۔ رام رکھامل طالب۔ عبدالغفور مضطر۔ عبدالرحمان عابد یہ سب کے سب پنڈت یوگراج نظر کے فیضانِ صحبت سے مستفید تھے۔

اکمل جالندھری نے شاعری میں اپنا اُستاد حضرت علی رضا خاں رضا اٹاوی کو بنایا جو ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ۔ این۔ ڈبلیو۔ آر۔ دہلی ڈویژن میں ملازم تھے۔

اکمل نے بھی انٹرمیڈیٹ تک پڑھ کر کالج چھوڑ دیا تھا اور ریلوے کی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے۔ اسی تقریب سے وہ رضا صاحب کی رہنمائی میں باقاعدہ طور پر شعر کہنے لگے۔

اکمل صاحب کو تخلص کا عطیہ نظر سوہانوی صاحب سے ملا تھا۔ نام ان کا ہے پنڈت رام پرتاپ۔

میرے اور میرے بعض دوستوں کی طرح اکمل کو بھی اپنے بیشتر کلام سے محروم ہونا پڑا۔ یہ حادثہ قریب قریب ہر شاعر کو پیش آیا کرتا ہے۔ چنانچہ ان کا سنہ ۱۹۳۴ء تک کا مجموعۂ کلام بھی جواُن کے بھائی کے ہینڈ بیگ میں محفوظ تھا۔ نارنول سے دہلی کے سفر کے دوران کسی نے اُڑا لیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اُڑانے والے کی نیت ہینڈ بیگ کو اُڑانے کی تھی۔ اکمل کے کلام کا نوحہ

کی نظموں میں ایک خاص دل گداز کیفیت پائی جاتی ہے۔

اکمل نے اپنی نظموں میں پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نیز ڈاکٹر اقبال کو بھی خطاب کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ان کے دل میں مسلمانوں کے لئے بھی کتنی جگہ ہے۔

شاعر تو بالعموم آزاد طبیعت ہوتا ہے اس کو دیر و حرم اور برہمن و شیخ کے باہمی تفضیوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس کے دل میں تو عالمگیر محبت کا دریا موجزن ہوتا ہے۔ اسی لئے شاعر کبھی دین و مذہب میں تنگ نظری سے کام نہیں لیتا۔ وہ بہت وسیع نظر اور بہت کشادہ دل رکھتا ہے۔ اکمل جالندھری کی شخصیت اور ان کے کلام میں بھی یہ دونوں وصف موجود ہیں۔

اکمل صاحب کے کلام کو مجموعی طور پر دیکھنے سے پتہ چلے گا کہ ان کی زبان صاف اور سلیس ہے اور بندشیں بھی چست ہیں۔ خاص طور پر 'بسنت' والی نظم میں کافی زور ہے۔ اس کے علاوہ نئی دنیا کی تعمیر' اور 'امیدیں' ان دونوں نظموں میں بھی اکمل نے ایک صحت مندانہ پیغام دیا ہے 'کرشن مراری' 'بھگوان رام' اور 'سنت تلسی داس' کے متعلق بھی ان کی نظمیں قابل قدر ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت امام حسینؑ پر بھی ان کی نظمیں ان کے صلح کل مسلک کی شاہد ہیں۔

اکمل صاحب نے رباعیاں کم کہی ہیں مگر جتنی کہی ہیں اچھی کہی ہیں۔

اکمل کی خصوصیات ان کی سادگی مزاج ہے جس کا اثر ان کی پوشاک اور دوسرے اطوار کردار پر بھی پڑتا ہے۔ اتنی مشق کے باوجود وہ کبھی برخود غلط نہیں ثابت ہوئے۔ انھوں نے کبھی کوئی بے جا دعویٰ نہیں کیا۔

وہ اپنے صحیح مقام کو سمجھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے ظرف میں اوچھا پن نہیں ہے بلکہ ان کی شخصیت میں ان کے کلام کی طرح ایک خوش گوار جاذبیت موجود ہے اور انھیں دیکھ کر ہمیں منشی پریم چند کے مشہور مقالہ "ایک اچھا آدمی ہی ایک اچھا ادیب ہو سکتا ہے" کی بے ساختہ تائید کرنی پڑتی ہے۔

مجھے پوری امید ہے کہ اکمل صاحب کے صحت مند کلام کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

منور لکھنوی (دہلی)
۲۵ ستمبر ۱۹۵۶ء

بوئے گل

(جناب پروفیسر خواجہ احمد صاحب فاروقی)

یہ مجموعہ جناب اکمل جالندھری کے
کلام کی پختگی اور شگفتگی کو ظاہر کرتا ہے
افسوس ہے کہ میں بے فرصتی کی وجہ
سے اس پر تبصرہ نہ کر سکا۔

خواجہ احمد فاروقی۔ دہلی

۲۰ر اگست ۱۹۵۶ء

رُباعی

اِک موجِ حیاتِ جاودانی ہوں میں
سرچشمۂ اسرارِ نہانی ہوں میں
یہ راز سمجھتے ہیں سمجھنے والے
کم فہم سمجھتے ہیں کہ فانی ہوں میں

(اکمل جالندھری)

۱

زبان خاموش ہوتی ہے نظر سے کام ہوتا ہے
اسی ماحول کا شاید محبت نام ہوتا ہے

ترا دیوانہ ہوتا ہے، بجرمِ عام ہوتا ہے
زہے قسمت جو کوئی اس طرح بدنام ہوتا ہے

فنا کے بعد پروانے کی میت بھی نہیں اٹھتی
گنہگارِ محبت کا یہی انجام ہوتا ہے

یہ کیا انصاف ہے یارب کرے کوئی بھرے کوئی
نگاہوں کی خطا ہوتی ہے دل بدنام ہوتا ہے

محبت میں تجھے یہ بھی خبر ہے اے دلِ ناداں
ترا ایک ایک ارماں اک خیالِ خام ہوتا ہے

نکل پردوں سے اے پردہ نشیں اب کس لئے پردہ
کہ راز اب تیرے دیوانے کا طشت از بام ہوتا ہے
تصویر اور نظارے میں ہے بس امتیاز اتنا
وہ منظر خاص ہوتا ہے یہ منظر عام ہوتا ہے
جہانِ عشق کے آئین ہیں کچھ مختلف الکل
وہ اس میں کامراں ہوتا ہے جو ناکام ہوتا ہے

۲

عروجِ نشۂ مے کا جواب ہوتا ہے
جب اپنے اوج پہ دورِ شباب ہوتا ہے
تری طلب میں جو کوئی خراب ہوتا ہے
مآلِ کار وہی کامیاب ہوتا ہے
سکوں پذیر مرا اضطراب ہوتا ہے
کسی کا غم بھی خوشی کا جواب ہوتا ہے
جمالِ یار کو پردے کی احتیاج نہیں
یہ خود حجابِ رُخِ بے نقاب ہوتا ہے
اب اور اس کے مقابل کی جستجو ہے فضول
کہ خود نظارہ نظر کا جواب ہوتا ہے
وہ تیرا وصل جسے جنّتِ نشاط کہیں
وہ تیرا ہجر کہ جینا عذاب ہوتا ہے

بغیر عشق و محبت کے آدمی کا دل

وہ آئینہ ہے جو بے آب و تاب ہوتا ہے
نوازتی ہے جسے آپ کی نگاہِ کرم
وہ ذرّہ اپنی جگہ آفتاب ہوتا ہے
کھُلا ہے میکدۂ عشق اور ہر میکش
بقدرِ ذوقِ طلب فیضیاب ہوتا ہے
وہ بے نقاب تو ہونے کے واسطے ہو جائے
مگر نظامِ دو عالم خراب ہوتا ہے
طریقِ عشق کی منزل کٹھن ہزار سہی
سفر اسی کا مگر کامیاب ہوتا ہے
کہیں نگاہِ کرم بھُول کر نہیں ہوتی
کہیں کرم پہ کرم بے حساب ہوتا ہے
جسے زمانہ سمجھتا ہے دل لگی اکمل
وہ عشق باعثِ صد انقلاب ہوتا ہے

پوچھیں نشانِ منزلِ جاناں خضر سے کیا
کامل ہے شوق اگر تو غرض راہبر سے کیا

جب آشیاں ہی اپنا چمن زار میں نہیں
کیا شاخ سے غرض ہمیں مطلب ثمر سے کیا

میں ناشناسِ عظمتِ دیر و حرم نہیں
نسبت انھیں مگر ہے ترے سنگِ در سے کیا

کیوں پوچھتے ہو مجھ سے مری داستانِ غم
پنہاں ہے میرا حال تمہاری نظر سے کیا

اہلِ نظر پہ حُسنِ دو عالم ہے بے نقاب
پردے میں چھُپ سکو گے تم اہلِ نظر سے کیا

بس ایک جذبِ شوق کی تکمیل چاہیئے
جلوے ترے ہیں دُور ہماری نظر سے کیا

ہم میکشوں کو عشرتِ جم ہے بس ایک جام
حاصل ہی فکرِ سلطنتِ بحر و بر سے کیا

شوقِ چمن اگر ہو قفس لے اُڑیں اسیر
یہ کیا کہا۔ کہ فائدہ ہی بال و پر سے کیا

اُٹھتے ہیں شعلے پھر مرے قلب و جگر سے کیوں
پھر واسطہ پڑا کسی برقِ نظر سے کیا

اِس دور میں ہنر کا نہیں قدرداں کوئی
اکملؔ بتاؤ فائدہ عرضِ ہنر سے کیا

(۴)

خمخانۂ جہاں میں رکھا ہی اور کیا تھا
اِک رند آرہا تھا اِک رند جا رہا تھا

وہ دن گئے جنوں سے جب بے نیاز تھے ہم
یہ وقت دوسرا ہے وہ وقت دوسرا تھا

اے زندگی مبارک اِک داغِ دل کے دم سے
وہ گھر بسا ہوا ہے جو گھر اُجڑ چکا تھا

قیدِ قفس میں بھی مَیں آباد تھا چمن میں
جب تک ہری نظر میں عالم بہار کا تھا

یوں کہئے بات رکھ لی داغِ جگر نے ورنہ
یہ زندگی بھی کیا تھی بُجھتا سا اِک دِیا تھا

رودادِ دل کو اُنکی نظریں سمجھ رہی تھیں
نظریں جو کہہ رہی تھیں وہ دِل سمجھ رہا تھا

کوئی نہ پھر سمایا اکمَل نگاہ و دل میں
ایسا نگاہ و دل میں کوئی سما چکا تھا

(۵)

کیا بجز غمِ عشق میں ساماں نہیں ہوتا
موجیں نہیں ہوتی ہیں کہ طوفاں نہیں ہوتا

ہر دور ہے دُنیا کے لئے دورِ مصیبت
کس دَور میں انسان پریشاں نہیں ہوتا

جس وقت گلستاں میں نہ ہوں اہلِ گلستاں
اُس وقت گلستاں بھی گلستاں نہیں ہوتا

جس راہ میں مشکل ہی نہ کوئی نظر آئے
اُس رہ سے گزرنا بھی تو آساں نہیں ہوتا

کس درجہ ہے اب پستیٔ اخلاق نظر میں
اس پر بھی تو انسان پشیماں نہیں ہوتا

اکملؔ ترے حالات کو کیونکر کوئی سمجھے
چہرے سے ترے غم بھی نمایاں نہیں ہوتا

زہے قسمت وہ منظر رونما ہے چاند تاروں سے
پسِ پردہ کوئی جیسے بُلاتا ہو اشاروں سے

کہیں کس سے غمِ اُلفت کے مارے غم کا افسانہ
زمانہ دُور رہتا ہے غمِ اُلفت کے ماروں سے

ہمیں کیا ہے خزاں کا دَور ہو یا موسمِ گُل ہو
خزاں کا غم تو اُن کو ہو جو کھیلے ہوں بہاروں سے

بچا سکتا ہے غرقابی سے اُس کو ناخدا کیونکر
سفینہ غرق ہو جائے جو ٹکرا کر کناروں سے

بُجھا لیتا ہوں اپنے آنسوؤں ہی سے اُسے ہمدم
بھڑک اُٹھتی ہے جب کچھ آگ سی دل کے شراروں سے

حقیقت میں یہ دیوانے بڑے ہشیار ہوتے ہیں
پہنچ جاتے ہیں منزل پر جو پہلے ہوشیاروں سے

کہاں اہلِ خرد ہیں اور کہاں اہلِ جنوں اکملؔ
کوئی نسبت نہیں نامحرموں کو رازداروں سے

(۷)

غمِ عشق میں کون کام آ رہا ہے
جو کام آ رہا ہے تو جام آ رہا ہے
شباب اُن کا ہے مرکزِ کیف و مستی
نظر ہے کہ گردش میں جام آ رہا ہے
نظر ہو رہی ہے نظر کے مقابل
سلام آ رہا ہے، پیام آ رہا ہے
اُدھر محفلِ دَورِ صہبائے رنگیں
اِدھر خونِ دل ہے جو کام آ رہا ہے
نہ مایوس ہو دستِ ساقی سے اکمل
وہ جام آ رہا ہے وہ جام آ رہا ہے

ترے غم سے کنارا اور کب تک
یہ بدنامی گوارا اور کب تک
تلاطم خیز ہے بحرِ محبت
اُمیدوں کا سہارا اور کب تک
رموزِ جلوہ ہائے ناز کھولو
پسِ پردہ اشارا اور کب تک
خیالِ دُخترِ رز کے آسرے پر
کریں ساقی گذارا اور کب تک
نظر کے سامنے آکر رہیں گے
وہ دل میں جلوہ آرا اور کب تک
جمال انگڑائیاں لینے لگا ہے
ہمارا دل ہمارا اور کب تک

نگاہِ منتظر اُکتا رہی ہے
غمِ حسنِ دل آرا اور کب تک
اشارہ ہے مآلِ رنگ و بُو کا
چمن کا یہ نظارا اور کب تک
کسی بیگانہ خو کی دُھن میں اکمل
پھرے گا مارا مارا اور کب تک

ہے آرزو کہ پھر ہمیں رسوا کرے کوئی
کہتا ہے دل کہ خونِ تمنّا کرے کوئی

جز وِ سرِ نیاز بنے گا وہ سنگِ در
پہلے سرِ نیاز تو پیدا کرے کوئی

کچھ غم نہیں نگاہ اگر کامیاب ہے
ہاں ہاں ضرور شوق سے پردا کرے کوئی

کچھ بزمِ کائنات نہیں مسطحِ حیات
رخصت طلب نہ ہو تو یہاں کیا کرے کوئی

ہر سمت ہے تلاطمِ بحرِ غمِ جہاں
کیوں کر غمِ جہاں سے کنارا کرے کوئی

یہ کیا کوئی جہاں میں ہے مستِ مئے نشاط
حسرت بھری نگاہ سے دیکھا کرے کوئی

اکملؔ کسی کو تو نہ جہاں میں بُرا سمجھ
سمجھے بُرا جو تجھ کو تو سمجھا کرے کوئی

۱۰

نوازشِ نگہہِ فتنہ گر ہوئی تو ہے
کہ اپنی بزمِ سکوں منتشر ہوئی تو ہے

یہ اور بات ہے جلوؤں کی تاب لا نہ سکی
تری نظر کے مقابل نظر ہوئی تو ہے

کہے کہے نہ کہے اِس کو انقلاب کوئی
خدا کی خلق اِدھر سے اُدھر ہوئی تو ہے

بہانہ خوب ہی رسمِ پردہ داری کا
ترے جمال کی شہرت مگر ہوئی تو ہے

اِرادتاً نہ سہی تو باِتّفاق سہی
مگر اِدھر بھی کسی کی نظر ہوئی تو ہے

نگاہِ لطف جو ہم پر نہیں ہوئی بھی تو کیا
نگاہِ خاص برنگِ دِگر ہوئی تو ہے

اب اس پہ بھی کوئی بھٹکے تو کچھ علاج نہیں
چراغِ راہ تری رہگزر ہوئی تو ہے

خوشی خوشی نہ سہی سوگوار رہ کے سہی
جہاں میں عمر ہماری بسر ہوئی تو ہے
اب اس مہم کا ہو انجام کیا نہیں معلوم
مجالِ مرحلۂ پُرخطر ہوئی تو ہے
یہ چشمِ شوق پہ کیوں طعنہ سنج ہے دُنیا
کہ تابِ دیدِ تجلی نظر ہوئی تو ہے
بُجھی بُجھی سی سہی شمعِ زندگی اکمل
فروغِ جلوۂ داغِ جگر ہوئی تو ہے

(۱۱)

درگہہِ پیرِ مغاں معلوم ہے

اپنی منزل کا نشاں معلوم ہے

ماجرائے غم سناؤں کیا اُسے

جس کو میری داستاں معلوم ہے

بے طلب اِک بوند بھی مِلتی نہیں

شیوۂ پیرِ مغاں معلوم ہے

اجتنابِ یار بھی ہے التفات

بوالہوس کو یہ کہاں معلوم ہے

حالِ دل سُنئے زبانِ چشم سے

اِس کو ساری داستاں معلوم ہے

آپ کے [illegible]

[illegible] بجا [illegible]

[illegible]

[illegible] ۱ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(۱۲)

رہی زندگی مدّتوں مُنہ چھپائے
کچھ ایسے بھی دن دَورِ ہستی میں آئے

مسافر جو کشتی ہی میں ڈوب جائے
اُسے ناخدا کیا کنارے لگائے

جو ساقی خود اپنی نظر سے پلائے
تو پھر پینے والوں کو کیا ہوش آئے

ترا مست ہے بے نیازِ تعیّن
وہیں میکدہ ہے جہاں سر جھکائے

کبھی درد بن کر کبھی نور بن کر
وہ دل میں سمائے نظر میں سمائے

محبت کی ہمت شکن گھاٹیوں میں
وہ منزل بمنزل مرے ساتھ آئے

بہا اشک ایسے نہ اے دیدۂ تر
اِن اشکوں میں دُنیائے دل بہ نہ جائے

نہیں معتبر شعلۂ عشق جب تک
ہر اِک آرزو داغِ دل بن نہ جائے

تبسّم ترا زندگی کا تبسّم
جو تو مُسکرائے جہاں مسکرائے

عبث ہے بھروسہ زمانے کا اکملؔ
زمانہ ترے کام آیا نہ آئے

(۱۳)

سمجھ سکتے ہوں اہلِ دل تو یہ رازِ نہاں سمجھیں
بجز نقصِ نظر پردہ نہ کوئی درمیاں سمجھیں

ہماری زندگی آزاد ہے قیدِ تعیّن سے
وہیں ہے وہ خداوندِ دو عالم ہم جہاں سمجھیں

نظر میں تنگیاں پیدا ہوں اس درجہ معاذ اللہ
کہ ہم قیدِ قفس کو بھی فراغِ آشیاں سمجھیں

زمانہ ہو مری رودادِ غم سے آشنا کیونکر
جو سب مجھ سے ہوں دیوانے تو میری داستاں سمجھیں

نگاہیں تیرے دیوانے کی پڑتی ہیں دو عالم پر
جنوں کی برکتیں کیا ہوشمندانِ جہاں سمجھیں

خضر سے کام کیا اُن رہروانِ منزلِ حق کو
جو اپنے ہر قدم کو اپنی منزل کا نشاں سمجھیں

نہاں ہوتے ہوئے بھی تم عیاں ہو ذرّے ذرّے سے
بتاؤ تو کہاں تم کو نہ سمجھیں ہم۔ کہاں سمجھیں
ابھی تک دستِ گلچیں میں ہے گلشن کی نگہبانی
ہو اپنا باغباں تو اِس کو اپنا گلستاں سمجھیں
کچھ ایسے بھی تو ہیں بیگانگانِ رنگ و بو اکمل
جو اپنے گلستاں کو بھی نہ اپنا گلستاں سمجھیں

(۱۴)

وہ بیقرار ہوں جس کو کہیں قرار نہیں
بہار میں بھی میں آسودۂ بہار نہیں
کبھی کسی کی طرف ہے کبھی کسی کی طرف
نگاہِ شوخ ترا کوئی اعتبار نہیں
نہ پوچھ ضبط پہ ہے اختیار اُسے کتنا
وہ آنکھ فرطِ الم سے جو اشکبار نہیں
نگاہِ عشق کی یہ بے قراریاں بے سُود
تمھارے حُسن کے جلوے جو بیقرار نہیں
بہار گو ہے پیامِ شگفتِ لالہ و گُل
کھلے نہ جس سے کلی دل کی وہ بہار نہیں

عجیب ہے تیری دنیائے میکدہ ساقی
جو ہوشیار ہیں ظاہر میں ہوشیار نہیں

وہ اور منتظرِ دید یوں ہمیں دیکھیں
سمجھ لیا کہ ہمیں محوِ انتظار نہیں

کرم نہیں نہ سہی ہیں کرم سے درگذرا
یہ کیا ستم پہ بھی مائل ستم شعار نہیں

ہر اشکِ خوں ہے مراجانِ گلستاں اکمل
ہزار شکر ارکہ منت کشِ بہار نہیں

۱۵

ترے نزدیک آنا چاہتا ہوں
نظر کو آزمانا چاہتا ہوں
بنیں جو بڑھ کے سیلابِ قیامت
وہ دو آنسو بہانا چاہتا ہوں
جہاں میں انگلیاں اُٹھنے لگی ہیں
جہاں سے ہاتھ اُٹھانا چاہتا ہوں
بطرزِ نَو دلِ بے آرزو میں
نئی دُنیا بسانا چاہتا ہوں
وہی اپنا نہیں بنتا جہاں میں
جسے اپنا بنانا چاہتا ہوں

زمانے کی ہر اِک رسمِ کہن کو
مٹانا ہاں مٹانا چاہتا ہوں
جسے سُن کر فضائیں جھوم اُٹھیں
وہی نغمہ سُنانا چاہتا ہوں
غضب کی بے خودی ہوتی ہے طاری
میں جب آپے میں آنا چاہتا ہوں
میں اکمل داغِ دل کی روشنی سے
جہاں کو جگمگانا چاہتا ہوں

(۱۶)

غیر سے رسم و راہ کرتا ہوں
کسی صورت نباہ کرتا ہوں

حرج کیا ہے جو چاہ کرتا ہوں
کیا کوئی میں گناہ کرتا ہوں

وہ نگاہیں ادھر نہیں کرتے
جس طرف میں نگاہ کرتا ہوں

تجھ پہ مرنا کوئی گناہ نہیں
اس لئے یہ گناہ کرتا ہوں

اب تو وہ بھی اثر نہیں رکھتی
دل سے پیہم جو آہ کرتا ہوں

ایک دو ہوں تو کچھ شمار بھی ہو
جانے کتنے گناہ کرتا ہوں

دیکھنا ہے فروغِ جلوۂ حسن
دل میں پیدا نگاہ کرتا ہوں

دیکھ لیتا ہوں اِک نظر تم کو
اور میں کیا گناہ کرتا ہوں

پھر کسی کی نگاہ کو اکمل
مائلِ رسم و راہ کرتا ہوں

زمانے کی طرح اپنا غمِ سوزِ نہاں کیوں ہو
فغاں برلب ہوں کیوں ہم آنکھ سے آنسو رواں کیوں ہو

ہو جس دل میں تیری اُلفت وہ مصروفِ فغاں کیوں ہو
کوئی غم ہائے اُلفت کا جہاں میں رازداں کیوں ہو

سفینہ ہو مرا غرقابِ طوفاں دُور ساحل سے
مری رودادِ غم سے آشنا سارا جہاں کیوں ہو

نگاہیں جا پڑیں وحشت میں کیوں چاکِ گریباں پر
جنونِ عشق میں اتنا بھی احساس و گُماں کیوں ہو

منوّر ہے مرا دل جب ترے فیضِ تصوّر سے
شبِ ہجراں مرے نزدیک پھر ظلمت فشاں کیوں ہو

طریقِ عشق میں جب سرفروشی شرطِ اوّل ہے
تو پھر عشاق کا منزل بمنزل امتحاں کیوں ہو

یہ مانا نغمہ زن ہو تم مرے سازِ تصوّر میں
مگر سازِ تصوّر کا بھی پردہ درمیاں کیوں ہو

خدا رکھے مرے قلبِ حزیں کی ضبط سامانی
محبّت ہے تو آخر شکوۂ دردِ نہاں کیوں ہو

ہائے لے آئی کہاں گردشِ دوراں مجھکو

ذرّہ ذرّہ نظر آتا ہے پریشاں مجھکو

کاٹنے دے مجھے کچھ ہجر کی گھڑیاں اے موت

ابھی کرنے ہیں کئی کارِ نمایاں مجھکو

جن کی تعمیر میں مصروف رہے ظلم کے ہاتھ

ڈگمگاتے نظر آتے ہیں وہ ایواں مجھکو

جس کے پیتے ہی دو عالم کی حقیقت کھُل جائے

میرے ساقی ہو عطا وہ مۓ عرفاں مجھکو

بزمِ رنداں ہی وہ دُنیائے محبّت ہے جہاں

نظر آیا کوئی ہندو نہ مسلماں مجھکو

ہو گئی گردشِ دوراں کی غرض کیا تبدیل
آ گئی راس یہ کیوں گردشِ دوراں مجھکو

کس قدر تفرقہ انداز ہیں آثارِ قفس
میں گلستاں کو ترستا ہوں گلستاں مجھکو

کوئی پردہ نگہِ شوق میں پردہ نہ رہا
اُن کے جلوے نظر آنے لگے عُریاں مجھکو

ہوں وہ لذت کشِ ہنگامۂ طوفاں اکمل
مایۂ عیش ہے ہر موجۂ طوفاں مجھکو

(۱۹)

تیرے دیوانوں کو جینے کی خوشی ہوتی نہیں
غمزدوں کو آرزوئے زندگی ہوتی نہیں

تیری جانب سے جو پینے کا اشارہ ہی نہ ہو
کامراں مقصد میں اپنے میکشی ہوتی نہیں

منکرِ حق ہو نہیں سکتا جہاں میں حق شناس
تیرگی جب تک ہو دل میں روشنی ہوتی نہیں

جب کسی کے دیدہ و دل میں سما جاتے ہیں آپ
پھر کسی شے سے اُسے دلبستگی ہوتی نہیں

یا خُدا یہ کیا مُصیبت ہے جہانِ عشق میں
کوئی شے وجہِ سکونِ زندگی ہوتی نہیں

زندگی کا غم وہ ہونا ضروری بات ہے
زندگی میں غم نہ ہوں تو زندگی ہوتی نہیں

جس کو تیرے عشق کی مستی میسّر ہے اُسے
کوئی غم ہوتا نہیں کوئی خوشی ہوتی نہیں

اس میں کیا چارہ کسی کا یہ تو دل کی موج ہے
فصلِ گُل پر منحصر دیوانگی ہوتی نہیں

ہائے وہ عالم دلِ اکملؔ کا ان کے سامنے
بیخودی ہوتی ہے کچھ کچھ بیخودی ہوتی نہیں

تجھ سے ہے رسم و راہ جب دہر سے رسم و راہ کیا
عرش نشیں ہوں فرش پر میری پڑے نگاہ کیا

ذوقِ طلب ترا ہے خام اے دلِ شکوہ سنجِ ہجر
اہلِ طلب سے دور ہے حسن کی بارگاہ کیا

تیرا جمال۔ برقِ طور۔ میری نظر حجابِ نور
یعنی ابھی ترے حضور میری اُٹھے نگاہ کیا

دیدۂ دل اگر نہیں جلوہ گہِ بہارِ حسن
اور بہارِ حسن کی ہے کوئی جلوہ گاہ کیا

کس کی نگاہِ شوق میں دید کی حسرتیں نہیں
دیکھ لیا تمھیں اگر ہم نے کیا گناہ کیا

جلوۂ حسنِ دوست سے تابشِ مہر و ماہ ماند
جلوۂ دوست کے حضور تابشِ مہر و ماہ کیا

خم کدۂ حیات اب غم کدۂ حیات ہے
اکمل بے نوا کہے حالِ دلِ تباہ کیا

(۲۱)

تمھیں بھی یاد ہے کیا وہ نظارا
شبِ مہتاب دریا کا کنارا
پیامِ انقلابِ زندگی ہے
تری نظروں کا ادنیٰ سا اشارا
جسے ڈھونڈا گئے دیر و حرم میں
وہ بزمِ دل میں نکلا جلوہ آرا
سنبھل اے دل کہ دریائے محبت
وہ دریا ہے نہیں جس کا کنارا
چلے بھی آؤ ڈوبا جا رہا ہے
مرے دل کی اُمیدوں کا ستارا

ہمارا کون پھر ہوتا جہاں میں
اگر اے غم نہ تو ہوتا ہمارا

ترا احسان ہے اے بحرِ اُلفت
ڈبو کر اور بھی تو نے اُبھارا

ہوا یہ منکشف غرقاب ہو کر
نہ دریا تھا نہ دریا کا کنارا

جو اپنے سائے سے شرما رہے تھے
مری نظروں میں ہیں وہ آشکارا

سہارا کیا کسی کو دے وہ اکمل
زمانے میں جو ہو خود بے سہارا

(۲۲)

حسن کا خیر خواہ ہونا تھا
عشق سے یہ گناہ ہونا تھا

غرقِ موجِ نگاہ ہونا تھا
یعنی دل کو تباہ ہونا تھا

عرضِ مطلب سے بھی نہ بات بنی
ہم سے یہ بھی گناہ ہونا تھا

دل سے بھی ہم نباہ کر نہ سکے
اور کس سے نباہ ہونا تھا

تجھ کو اے دل کسی کی محفل میں
رازدارِ نگاہ ہونا تھا

چار دن کی حیاتِ فانی میں
کیا سپید و سیاہ ہونا تھا

ہو کے پامالِ راہِ شوق اے دل
روکشِ مہر و ماہ ہونا تھا

وعدۂ دل فریب پر کمال
دل خراب و تباہ ہونا تھا

(۲۳)

جہاں گلستاں ہے وہیں آشیاں ہے
جہاں آشیاں ہے وہیں گلستاں ہے

مری زندگی کی عجب داستاں ہے
نہ دل اس سے آگہ نہ واقف زباں ہے

مرا آشیاں وسعتِ دوجہاں ہے
زمیں ہے مری یہ مرا آسماں ہے

گراں یہ بھی منصب میں وہ بھی گراں ہے
جبیں ہے جبیں آستاں آستاں ہے

ترا حسن ہے قلزمِ کیف و مستی
مرا جذبۂ عشق موجِ رواں ہے

مرے حوصلے مطمئن ہیں کہاں تک
تری ہر عنایت مرا امتحاں ہے
ترا حسن ہے اور چشمِ تصوّر
نظر درمیاں ہے نہ دل درمیاں ہے
سناؤں کسے داستانِ محبّت
یہاں کون ہے جو مرا ہم زباں ہے
عجب حال ہے ان دنوں میکدے کا
نہ مئے ہے نہ میکش نہ پیرِ مغاں ہے
یہ مانا ہے اک فردِ ناچیز انکمل
ہے آگاہ تجھ سے ترا رازداں ہے

(۲۴)

کرنی ہے اپنے غم کی حکایت بیاں مجھے
اے کاش ہو نصیب کوئی ہم زباں مجھے

وحشت بہار میں تھی خزاں میں غمِ بہار
آیا نہ راس نظمِ بہار و خزاں مجھے

اللہ رے یہ بے خودئ ذوقِ جستجو
میں دل کو ڈھونڈتا ہوں دلِ ناتواں مجھے

بعدِ نظارہ بھی ہوں وہی تشنہ کامِ دید
آئے نظر۔ مگر نظر آئے کہاں مجھے

مجھ سا نہ عشق میں کوئی رسوائے دہر ہو
ہر شے سُنا رہی ہے مری داستاں مجھے

اب تک ہے آرزو اُنہی لمحاتِ عیش کی
اب تک ہے برق سے گلۂ آشیاں مجھے

میں نے کئے ہیں دیر و حرم کے مشاہدات
معلوم ہے حقیقتِ رازِ نہاں مجھے

عالم کن آفتوں کا مرقع ہے کچھ نہ پوچھ
آنا پڑے خدا نہ کرے پھر یہاں مجھے

میری نظر میں ہیچ ہیں دنیا کی نعمتیں
بخشی وہ تو نے دولتِ دردِ نہاں مجھے

میرا سخن ہے باعثِ تسخیرِ کائنات
کہتی ہے خلق اکملؔ جادو بیاں مجھے

(۲۵)

ہم نے رنگِ جہاں کو دیکھ لیا — فصلِ گُل کو خزاں کو دیکھ لیا

کوئی تم سا جہاں میں اور نہیں — ہم نے سارے جہاں کو دیکھ لیا

ہائے مجبوریاں اسیروں کی — دُور سے آشیاں کو دیکھ لیا

دل کی ہر چوٹ پھر اُبھر آئی — جب کسی ناتواں کو دیکھ لیا

اب کسی شاخ کی بھی خیر نہیں — برق نے آشیاں کو دیکھ لیا

جمع ہیں کیسے کیسے لوگ نہ پوچھ — بزمِ پیرِ مغاں کو دیکھ لیا

جاودانی کہیں بہار نہیں — دشت کو گلستاں کو دیکھ لیا

آج دیوانگی کے عالم میں
اکملِ نکتہ داں کو دیکھ لیا

(۲۶)

نازہے تجھ کو اگر تیرِ نگاہِ ناز کا
حوصلہ کچھ کم نہیں چشمِ نظارہ باز کا

دور ہے جوشِ جنونِ عشق کے آغاز کا
عکس ہر ذرّہ میں ہے اُس کی حریمِ ناز کا

اُس طرف ہوں گی زمانے کی نگاہیں روبہ چشم
رُخ جدھر ہو گا تری چشمِ زمانہ ساز کا

کیوں نہ اس کی دھڑکنوں میں ہو پیامِ زندگی
دل ہی تو ہے خاص پردہ زندگی کے ساز کا

جس نگاہِ ناز پر ہیں سیکڑوں جانیں نثار
ہاں اِشارہ اِک اِدھر بھی اُس نگاہِ ناز کا

کیا اسی تکمیل کا ہے نام تکمیلِ جنوں
جب صدائے دل پہ دھوکا ہو تری آواز کا
عشق کے مارے ہوؤں کو ہے پیامِ زندگی
ایک ہلکا سا تبسم اُس نگاہِ ناز کا
اور بڑھ جاتی ہے اے اکمل مری دیوانگی
چھیڑتا ہے جب کوئی قصہ نیاز و ناز کا

(٢٧)

تصوروں میں شبِ انتظار کا عالم — بھری خزاں میں نمودِ بہار کا عالم

نہ پوچھئے دلِ دیوانہ وار کا عالم — خزاں میں بھی نظر آیا بہار کا عالم

ہزار داغ ہیں اور ان میں دل ہے یوں جیسے — کئی جنازوں میں اِک سوگوار کا عالم

ہزار شکوے تھے دل میں مگر زباں نہ کھلی — غضب تھا اِک نگہِ شرمسار کا عالم

حیات و زیست کا مقصود مل چکا اکمل
رہا اگر یہی لیل و نہار کا عالم

ہے ناممکن مری جنبشِ طلب کا رائیگاں ہونا

ترا نامہرباں ہونا بھی ہو جب مہرباں ہونا

چھپائیں لاکھ ہم پھر بھی محبّت چھپ نہیں سکتی

اِسے آتا ہے نظروں سے بہرصورت عیاں ہونا

کسی کے غم کا افسانہ یہاں کوئی نہیں سُنتا

دیارِ عشق میں بے سود ہے صرفِ فغاں ہونا

صدائیں آ رہی ہیں یہ زمینِ کوئے جاناں سے

کہاں تجھ کو نصیب اتنا بلند اے آسماں ہونا

یہ مانا عمر گذری ہے تری اے شیخ! سجدوں میں

جبینِ شوق کو آیا نہ اب تک آستاں ہونا

رہِ ترک و طلب کی منزلیں طے کر گیا اکملؔ

مبارک اے جنونِ عشق میرِ کارواں ہونا

(۲۹)

وہ ان کی ضد کہ ہمیں آزمائے جاتے ہیں
ہمیں یہ صبر کہ آنسو بہائے جاتے ہیں

تری نظر میں جو انداز پائے جاتے ہیں
وہی تو حشر مرے دل پہ ڈھائے جاتے ہیں

میں جتنا اُن کی نگاہوں سے بچ کے رہتا ہوں
وُہ اور دیدہ و دل میں سمائے جاتے ہیں

اِسی کا نام تو مجبوریاں نہیں شاید
جو غم نہ اُٹھتے تھے ہم سے اُٹھائے جاتے ہیں

وہ سوزِ غم نہیں چھپ جائے جو چھپانے سے
یہ اور بات ہے ہم مسکرائے جاتے ہیں

وہ آئے میری لحد پہ تو کیا تعجب ہے
جو رُوٹھتے ہیں وہی تو منائے جاتے ہیں

تصورات کی نیرنگیاں ارے توبہ
وہ آرہے ہیں۔ وہ آئے۔ وہ آئے جاتے ہیں

بڑھاؤ ہاتھ نہ پھولوں کی سمت خار ہیں یہ
خوشی میں رنج کے آثار پائے جاتے ہیں

کسی کے ناز بھی اکمل نہ ہم سے اُٹھتے تھے
اب اُن کے جورِ مسلسل اُٹھائے جاتے ہیں

(۳۰)

جو کسی غم سے بھی نڈھال نہیں
ایسا دل اپنے حسب حال نہیں

مجھکو ہر دم خیال ہے اُس کا
جس کو میرا کوئی خیال نہیں

حسرتِ دید لے کے آیا ہوں
اور میرا کوئی سوال نہیں

دل کی محویتیں خدا رکھے
اب کسی بات کا ملال نہیں

اِس طرف کیوں نہیں نگاہِ کرم
کیا ہمارا خراب حال نہیں

زندگی خواب ہے محبت کا
اِس سے آگے کوئی خیال نہیں

آئینہ دل کا ہے وہی لیکن
اب وہ پہلی سی دیکھ بھال نہیں

بے نیازی سی بے نیازی ہے
ہم کو اپنا بھی کچھ خیال نہیں

غمِ اُلفت جو ہو تو ہو اکمل
اور کوئی شریکِ حال نہیں

(۳۱)

پنہاں ہے ترا نور مرے قلب و جگر میں
میں کیا کہوں کیا کیا ترے جلوے ہیں نظر میں
دل اپنا بہلتا ہے نہ صحرا میں نہ گھر میں
جب سے نگہِ یار کے جلوے ہیں نظر میں
کیا جانے کوئی سوزِ محبّت کے کرشمے
اِک درد سا دل میں ہے تو اک داغ جگر میں
دردِ دلِ پُرغم کی ہے تصویر سراسر
آنسو نہیں آنسو یہ مرے دیدۂ تر میں
دردِ غمِ اُلفت کا مجھے شغل مُبارک
اِک لمحہ بھی بیکار نہیں آٹھ پہر میں
مُشکل نہ رہے نام کو بھی عِشق کی منزل
مل جائے کوئی رہبرِ اکمل جو سفر میں

(۳۲)

اُس طرف کیا ہے کام آہوں کا
رُخ جدھر ہو تری نگاہوں کا

تم کو دیکھا تو کیا گناہ کیا
دیکھنا کام ہے نگاہوں کا

زندگی کیا ہے زندگی کی قسم
آئینہ ہے مرے گناہوں کا

اور کیا ہے ضیائے شمس و قمر
عکس ہے تیری جلوہ گاہوں کا

دیکھنا اور تیرے جلووں کو
حوصلہ ہے مری نگاہوں کا

ہم نشیں. کیا ہے راہِ عشق نہ پوچھ
سلسلہ ہے طویل راہوں کا

خلق کہتی ہے جس کو غم اکملؔ
ہے دُھواں دل جلوں کی آہوں کا

(۴۳)

جنونِ عشق کا یارب یہ کیا دستور ہوتا ہے
یہ نعمت جس کو ملتی ہے وہی مجبور ہوتا ہے

ترے حُسنِ تصوّر سے جو دل معمور ہوتا ہے
جزاک اللہ وہ رشکِ جلوہ گاہِ طور ہوتا ہے

کسی کی بھی ترے آگے نہیں چلتی نہیں چلتی
وہی ہوتا ہے اکثر جو تجھے منظور ہوتا ہے

کسی عنواں غمِ اُلفت چھپایا جا نہیں سکتا
نگاہیں کام کرتی ہیں جو دل مجبور ہوتا ہے

نہ جانے چیز کیا پہلی نظر کا تیر ہے اکملؔ
جگر سے دُور ہوتا ہے نہ دل سے دُور ہوتا ہے

(۳۴)

یہ نظریں مار ڈالیں گی کسی کو — کوئی رویا کرے گا زندگی کو

فراغِ دل شبِ فرقت میں کیسا — کوئی نسبت نہیں غم سے خوشی کو

نہ مرنے میں نہ کچھ جینے میں لذّت — لگا دوں آگ ایسی زندگی کو

غمِ دوراں نہیں تو اور کیا ہے — جو کھائے جا رہا ہے آدمی کو

چراغِ عشق لَو دیتا ہے کیوں کر — بجھا کر دیکھ شمعِ زندگی کو

ہلا دیتی ہے دل کی ایک جنبش — دو عالم کے جمودِ زندگی کو

نہ ہونے کی طرح اس دور میں ہے — محبّت آدمی سے آدمی کو

دکھا بھی دے نقوشِ پا کا جلوہ — زمانہ مُضطرب ہے بندگی کو

تبسّم آ ہی جاتا ہے لبوں پر — صبا جب چھیڑ دیتی ہے کلی کو

سمجھتا ہے وہی کچھ راز اس کے — سمجھتا جو نہیں کچھ زندگی کو

یہ شوقِ دید بھی کیا شے ہے اکمل

نہ جینے دے نہ مرنے دے کسی کو

(۳۵)

وابستہ ہو گیا ہوں میں جب سے کسی کے ساتھ
اِک کیفِ مستقل ہے مری زندگی کے ساتھ

رشتے ہیں دوستی کے یہ سب زندگی کے ساتھ
ورنہ یہاں سے کون گیا ہے کسی کے ساتھ

جو مجھ کو زندگی سے زیادہ عزیز ہے
کیوں اُس کو دشمنی ہے مری زندگی کے ساتھ

دل کا کنول بُجھا ہے تو دُنیا بھی ہے سیاہ
پالا پڑا ہے مجھ کو یہ کس تیرگی کے ساتھ

محرم ہے کچھ وہی ترے انوارِ حسُن کا
جس کو نگاہِ خاص ملی بندگی کے ساتھ

(۳۶)

کتنا پُر کیف مرا عالمِ رندانہ ہے
میکدہ روح مری، دل مرا پیمانہ ہے

یوں تو ہر مردِ جہاں ہوش سے بیگانہ ہے
جس کو دے تو یہ لقب. وہ ترا دیوانہ ہے

مری محرومیٔ قسمت یہ کہاں سے لے آئی
کوئی اپنا ہے یہاں کوئی نہ بیگانہ ہے

ہے حقیقت میں وہ ہشیار، جسے ہوش نہیں
اور جو ہوش میں آجائے وہ دیوانہ ہے

دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ اے شیخِ حرم
ورنہ کعبہ ہے کہیں کوئی نہ بُت خانہ ہے

ہر دو عالم کی حقیقت سے خبردار ہوں میں
پھر بھی دُنیا مجھے کہتی ہے کہ دیوانہ ہے

میں ہوں وہ کشتۂ آزارِ محبت اکمل
جس کی رُوداد حقیقت ہے نہ افسانہ ہے

بخشی ہے دردِ دل نے مجھے لذّتِ حیات
سو راحتیں ہیں ایک غمِ زندگی کے ساتھ
اب کچھ اثر ہے دل پہ خوشی کا نہ رنج کا
کیا زندگی ملی ہے مجھے بےخودی کے ساتھ
صیاد اپنے دام و قفس کی منائے خیر
ہم تو گذار لیں گے خوشی ناخوشی کے ساتھ
دنیا میں ایک اکملؔ خانہ خراب ہے
غم جس کو بے شمار ملے زندگی کے ساتھ

(۳۸)

نظر سے جب نظر ملتی ہے کس کا دل سنبھلتا ہے
نہ اُن کا دل سنبھلتا ہے نہ میرا دل سنبھلتا ہے

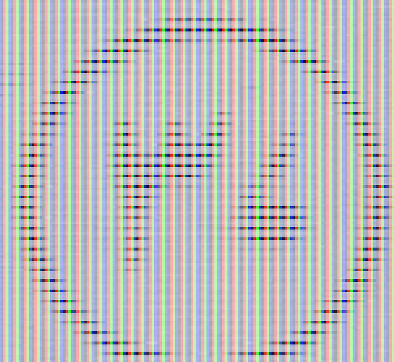
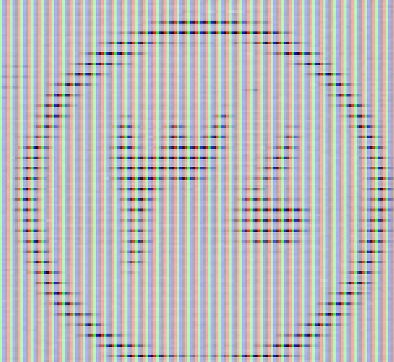
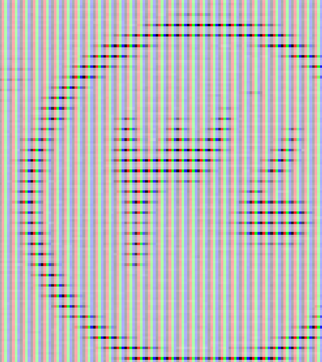
خدا رکھے زمانہ ہے یہ آغازِ محبّت کا
نظر اُن کی سنبھلتی ہے نہ اپنا دل سنبھلتا ہے

یہ کیا تلقین ہے دل کو سنبھالیں ہم شبِ فرقت
شبِ فرقت بتاؤ کب کسی کا دل سنبھلتا ہے

میں حال اپنا سناتا ہوں وہ حال اپنا سُناتے ہیں
یہی اک شکل ہے جس سے ذرا سا دل سنبھلتا ہے

نصیحت کام کچھ کرتی نہیں اُٹھتی جوانی میں
جو آنکھیں چار ہوتی ہیں تو پھر کیا دل سنبھلتا ہے

محبّت یوں اثر انداز ہے دونوں طرف انجمؔ
کہ اُن کا دل سنبھلتا ہے نہ اپنا دل سنبھلتا ہے

(۳۹)

دلِ پر الم - آنسوؤں کی روانی
کسی کی کہانی، کسی کی زبانی
یہ مانا کہ دُنیا کی ہر شے ہے فانی
مگر نعمتِ عشق ہے جاودانی
نسیمِ بہاراں - سمومِ خزانی
وہ تیری کہانی یہ میری کہانی
جسے لوگ کہتے ہیں عہدِ جوانی
وہی عہد ہے حاصلِ زندگانی
طلبگارِ عیش و طرب ہوں تو کیوں ہوں
سحر سے مری شامِ غم ہے سہانی

بجز اِس کے کیا ہیں یہ اشک اور آہیں
وہ آنکھوں کا قصّہ یہ دل کی کہانی
سکوتِ لبِ عاشقاں کے تصدّق
وہ ورِ غم دل کی ہے ترجمانی
تری مہربانی خدا جانے کیا ہو
ہے نامہربانی بھی جب مہربانی
زمانہ کرے گا مجھے یاد اکملؔ
سلامت مرا عالمِ شعر خوانی

(۴۰)

جب خودی کچھ آشنائے بیخودی ہونے لگی
دل کے ہر گوشے سے پیدا آگہی ہونے لگی

پھر خیالِ یار سے دل بستگی ہونے لگی
پھر غمِ اُلفت سے یعنی دوستی ہونے لگی

فصلِ گُل کا تذکرہ کرنے لگے لیل ونہار
کارفرما پھر مری دیوانگی ہونے لگی

اے خیالِ یار تیری کامیابی کے نثار
پھر دلِ مُردہ سے پیدا زندگی ہونے لگی

دل کی جانب پھر خدنگِ یار نے بدلا ہے رُخ
دل میں پھر آباد اِک دُنیا نئی ہونے لگی

عشق کا نیرنگ ہے یا حُسن کا یہ سحر ہے
کس کی حکمت سے بتوں کی بندگی ہونے لگی

دیکھئے اکملؔ شب غم کیا دکھائے تا سحر
گُل چراغِ آرزو کی روشنی ہونے لگی

(۴۱)

زندگی زندگی نہیں اپنی
اب تو اک سانس بھی نہیں اپنی

یہ وہ دنیائے عشق ہے جس میں
رنج اپنا خوشی نہیں اپنی

ہائے وہ آرزوئے ہر دو جہاں
آرزو جو بنی نہیں اپنی

غیر ممکن ہے چارہ سازیِ عشق
اب وہ حالت رہی نہیں اپنی

نگہِ شوق کیا ہوا تجھ کو
ہو کے اپنی کبھی نہیں اپنی

ایک دُنیا سما گئی دل میں
ایک دُنیا رہی نہیں اپنی

غم ترا دلنشیں ازل سے ہے
یہ خلش عارضی نہیں اپنی

وہ نہ جب تک بنیں خدا اکملؔ
بندگی بندگی نہیں اپنی

(۴۲)

جب سے جمالِ یار کا عالم نظر میں ہے
آسودگیٔ قلب نہ صحرا نہ گھر میں ہے

اپنی زباں سے کیا کہوں میں داستانِ غم
میرا جو حال ہے وہ تمھاری نظر میں ہے

اے اہلِ عشق کیا ہے یہی ابتدائے عشق
شعلہ سا ایک دامنِ قلب و جگر میں ہے

رنگیں بنا رہا ہے بساطِ حیات کو
وہ خونِ آرزو جو مری چشمِ تر میں ہے

کیا جانو تم فغانِ محبّت کی منزلت
نالہ برنگِ کیف تمھاری نظر میں ہے

وحشت زدوں کے حال کی ناصح کو کیا خبر
وجہِ سکونِ دل ہے وہ سودا جو سر میں ہے

بدلی ہوئی ہے صورتِ حالاتِ زندگی
اِک اور انقلاب کا عالم نظر میں ہے

خطرے میں زیست ہے تو ہے جینے کا لُطف بھی
کیا غم جو آشیانہ کنارِ شرر میں ہے

یہ کون ہو رہا ہے سُپردِ مآلِ کار
کس آرزو کا رنگ چراغِ سحر میں ہے

اکمل یہ اپنے دیدۂ حیرت سے پوچھئے
ہر آن کس کے حُسن کا عالم نظر میں ہے

(۴۳)

تھے جو حُسن و عشق کے درمیاں وہ تمام پردے اُٹھا دیئے
میرا دل وہ ہے تیری یاد نے جسے چار چاند لگا دیئے

تیرے غم نے بخشے وہ داغ ہیں، جو دِل حزیں کے چراغ ہیں
تیرے جی میں آیا جلا دیئے تیرے جی میں آیا بجھا دیئے

ہیں مقامِ عرش سے بھی پرے، جنھیں دی ہیں تو نے بلندیاں
ہوئے ننگِ فرشِ زمیں وہ دل جو نظر سے تو نے گرا دیئے

میرے آشیانے کا ذکر کیا۔ مجھے آشیانے کی فکر کیا
کئی آشیانے بنا لئے، کئی آشیانے جَلا دیئے

تیرے غم کی ہیں یہ عنائتیں، وہی عشق کی ہیں سخاوتیں
کہ ہزار ہا دُرِ بے بہا مری چشمِ تر نے لُٹا دیئے

نہ وہ فصلِ گُل، نہ وہ دورِ مُل، نہ وہ نغمہائے طرب کا غُل
نہ وہ رُت رہی، نہ وہ ہم رہے، نئے گُل فلک نے کھلا دیئے
نہیں کس کا فرقِ عبودیت، ترے آستانِ جمال پر
ترے سامنے سرِ پُر غرور، بڑے بڑوں نے جھکا دیئے
غمِ روزِ حشر سے دُور ہے، جسے دیکھو غرقِ سرُور ہے
تیری چشمِ بادہ فروش نے تو جہاں کے ہوش اڑا دیئے
ترے در پہ اکملؔ بے نوا، رہے تشنہ کام نہ ساقیا
کہ ہزار ہا خمِ میکدہ ہیں ترے کرم نے لُنڈھا دیئے

(۴۴)

دل و جگر کو یونہی داغدار رہنے دے
میری خزاں کو حریفِ بہار رہنے دے
کوئی فلک سے یہ کہہ دے کہ ہم پہ رحم کرے
ہنسی خوشی نہ سہی۔ سوگوار رہنے دے
مرے کریم نہیں ہوں کسی سے وابستہ
نفس نفس مجھے بیگانہ وار رہنے دے
حواس و ہوش مجھے دے کے خونِ شوق نہ کر
بساطِ دہر میں دیوانہ وار رہنے دے
ترے جمالِ فسوں ساز کی قسم تجھ کو
مجھے رہینِ شبِ انتظار رہنے دے
نگاہِ شوق کا پایانِ کار کچھ نہ سہی
اُمید دار کو اُمیدوار رہنے دے
ہوئی نصیب نہ تا زندگی کبھی اکملؔ
وہ اِک نظر جو ہمیں ہوشیار رہنے دے

(۴۵)

جفائے برق تھی مخصوص گلستاں کیلئے
کہ ایک شاخ بھی چھوڑی نہ آشیاں کیلئے
کسی نے جس کو نہ روزِ ازل قبول کیا
وہ دل خوشی سے لیا عشق نے فغاں کیلئے
چلے تو رہبرِ کامل کی رہنمائی میں
یہ احتیاط ضروری ہے کارواں کیلئے
کسی کے بس کا بھی اب روگ یہ نہیں یارب
کسی کو بھیج علاجِ غمِ جہاں کیلئے
مری نگاہ میں ہے حرفِ انقلاب اکمل
وہ لفظِ خاص کہ ہے گردشِ زماں کیلئے

(۴۶)

ہر آنسو جان و دل کی بیکسی کا راز ہوتا ہے
یہ ہے وہ نالۂ ماتم جو بے آواز ہوتا ہے

عیاں اِک جرعۂ مے سے جہانِ راز ہوتا ہے
باندازِ دگر پھر ہوش کا آغاز ہوتا ہے

وہ دیکھو ایک تازہ دوّر کا آغاز ہوتا ہے
وہ آئی صبح بابِ میکدہ پھر باز ہوتا ہے

وصالِ شاہدِ مقصود۔ غیرِ سعئ ناممکن
کہ انجام طلب ہمّت کشِ آغاز ہوتا ہے

ہوا کرتی ہے جس سے کائناتِ دل میں تبدیلی
الٰہی وہ نظر کا کون سا انداز ہوتا ہے

مذاقِ عشق کی سیری بغیر اس کے نہیں ممکن
کہ دل کا آئینہ رشکِ حریمِ ناز ہوتا ہے

وہیں تک نامکمل ہے جنونِ عاشقی اکمل
جہاں تک دل کو احساسِ نیاز و ناز ہوتا ہے

(۴۷)

تیری یاد کس شان سے دل نشیں ہے

باندازِ نَو چاند کی چودھویں ہے

تصوّر ترا کس قدر نازنیں ہے

جو ذرّہ بھی ہے وہ نہایت حسیں ہے

تری بے رُخی ہو تو ہے اِک جہنّم

وگرنہ یہ دُنیا بہشت بریں ہے

نظر میں ہیں گو لاکھ جلوے تمہارے

مِرا ذوقِ تشنہ جہاں تھا وہیں ہے

ملے خاک مُنکر کو تیرا ٹھکانہ

مُسافر کہیں اور منزل کہیں ہے

یہ سب فتنہ انگیزیاں ہیں جنوں کی
جو دامن بچا تو گریباں نہیں ہے
ہے کیا اور یہ قصۂ راحت و غم
جو تیری نظر کا کرشمہ نہیں ہے
تخیّل مرا عرش پیما ہے اکمَل
بلند آسمانوں سے میری زمیں ہے

(۴۸)

نہ گلستاں میں نہ صحرا میں نہ گھر جانے دے
دیکھیں اب دل ترے کوچے سے کدھر جانے دے

اب زیادہ ہمیں برباد نہ کر۔ جانے دے
کوئی دم چین سے اے چرخ گزر جانے دے

کبھی آرام سے گزری ہے کسی کی اے دل
جانے دے یہ گلۂ شام و سحر جانے دے

ہو گی اب روحِ مسرت کی اسی سے تہذیب
اور کچھ غم کے خد و خال نکھر جانے دے

دل کی دنیا ہی نہ بہ جائے ان اشکوں میں کہیں
ایسے طوفاں نہ اٹھا، دیدۂ تر جانے دے

زندگی اپنی ہے پابندِ رضائے محبوب
یعنی مر جائیں جو کوئی ہمیں مر جانے دے

کام کی چیز مری چشمِ تماشا کو بنا
اِسی مرکز پہ زمانے کو ٹھہر جانے دے

عالمِ خاک کُجا، جلوہ گہہِ پاک کُجا
اور کچھ دُور تجسّس کی نظر جانے دے

کیا خبر منزلِ مقصود کدھر ہے اکملؔ
دلِ وارفتہ کو جانا ہے جدھر جانے دے

(۴۹)

گزر جاتا ہے اب دامن بچا کر ہر بشر مجھ سے
زمانہ پھر گیا کیا پھیر لی تم نے نظر مجھ سے

ہوا ہے مرگ ساماں لمحہ دردِ فرقت کا
الٰہی زندگی اب کس طرح ہو گی بسر مجھ سے

نہ جانے کیوں مجھے اپنا گلستاں یاد آتا ہے
قفس میں اور بھی ہیں طائرِ بے بال و پر مجھ سے

محبت میں دلِ ایذا طلب کی خیر ہو یارب
کہ برگشتہ نظر آتا ہے کچھ دردِ جگر مجھ سے

میں وہ میکش ہوں جس نے گردشِ پیمانہ دیکھی ہے
ملائے گی بھلا کیا گردشِ دوراں نظر مجھ سے

معاذ اللہ طرحِ آشیاں کیا رنگ لائی ہے
بپا ہے دہر میں ہنگامۂ برق و شرر مجھ سے

کیا دیدار کا جب عزم میں نے۔ یہ صدا آئی
نظر مجھ سے ملاؤ گے؟ ملاؤ گے نظر مجھ سے؟

مرے دم سے جہانِ زندگی میں زندگی سی ہے
خدا شاہد کہ ہے یہ رونقِ شام و سحر مجھ سے

سپہرِ شاعری کا انجمِ روشن ہوں میں اکملؔ
رہیں گے تابہ کے اہلِ زمانہ بے خبر مجھ سے

کیا حال ہوا دل کا حسرت ہے نہ ارماں ہے
اُجڑے ہوئے اس گھر کا اللہ نگہباں ہے

کیا تفرقہ ڈالا ہے بے دردِ محبّت نے
میں دل سے پریشاں ہوں دل مجھ سے پریشاں ہے

یہ گریۂ پیہم ہے تمہیدِ قیامت کی
ہر اشک میں سو موجیں ہر موج میں طوفاں ہے

گردِ رہِ جاناں کا فیضان جزاک اللہ
جو خاک بداماں تھا اکسیر بداماں ہے

ہر جوشِ مسرت کا انجام ہے غم اکمل
ہر صبح کے پہلو میں اک شامِ غریباں ہے

۵۱

محبت کا جو حاصل ہے اُسے دل یاد کرتا ہے
کہ ہر زخم جگر شمشیرِ قاتل یاد کرتا ہے

میں وہ دل ہوں جسے ہر صاحب دل یاد کرتا ہے
میں وہ بسمل ہوں خود بھی جس کو قاتل یاد کرتا ہے

یہ آہیں۔ یہ فغاں۔ یہ اشک۔ آخر آپ کیا سمجھیں
گذر جاتی ہے جو دل پر، اُسے دل یاد کرتا ہے

مری ناکامیوں کا ہائے یہ عالم ارے توبہ
کہ اب مجھکو مرا دِل بھی بمشکل یاد کرتا ہے

مثل مشہور ہے اکمل کہ دل کو راہ ہے دل سے
تعجب کیا جو اہلِ دل کو یہ دل یاد کرتا ہے

(۵۲)

آسماں ہم کو مٹانے پہ تُلا ہے تو سہی
ہم غریبوں کا بھی دُنیا میں خُدا ہے تو سہی

ہاں مداوائے غمِ اہلِ وفا ہے تو سہی
ضبط خود چارہ گرِ جور و جفا ہے تو سہی

کیوں نہ دیوانگی دل میں اضافہ ہو جائے
وحشت افزا اثرِ خونِ وفا ہے تو سہی

ہم نے مانا کہ ہے پردوں میں نہاں تو اے دوست
تیرے جلوؤں کا مگر شور بپا ہے تو سہی

ہم نے مانا گلۂ جور و جفا ہے بے سُود
یہ محبّت میں بہر کیف روا ہے تو سہی

رنگ اُڑ جائے جو پھولوں کا تو حیرت کیوں ہے
شر انگیز گلستاں کی ہوا ہے تو سہی
تو بظاہر نظر آتا نہیں آنکھوں کو تو کیا
خانۂ دل میں مگر جلوہ نما ہے تو سہی
میں نے مانا کہ میری آہ میں تاثیر نہیں
یہ مرے قلبِ شکستہ کی صدا ہے تو سہی
اور کیا چاہئے دورانِ محبت اکمل
گرمیٔ سوزِ جگر حد سے سوا ہے تو سہی

۵۳

حالت بتاؤں کیا مرے سوزِ نہاں کی ہے
بھڑکی ہوئی یہ آگ نہ جانے کہاں کی ہے

عقل و جنوں کی منزلیں طے ہو چکیں تمام
اے پائے شوق اب ترے جی میں کہاں کی ہے

رکھا ہے داغِ دل کو چھپا کر بس اِس لئے
سوغات آخری یہ کسی مہرباں کی ہے

صورت بدل چکی ہے نگاہوں میں دم نہیں
تصویر دیکھ لو یہ دلِ ناتواں کی ہے

ہے کس مقام پر مری دیوانگی نہ پوچھ
سجدوں کا ہوش ہے نہ خبر آستاں کی ہے

کیا حُسن کو پڑی ہے اُڑائے جو خاکِ عشق
لگ جائے گی ٹھکانے جو مٹی جہاں کی ہے

اکملؔ جنوں سے دُور بہت گو ہے آگہی
وحشت زدوں کو پھر بھی خبر دو جہاں کی ہے

۵۴

جی اُٹھے مارے ہوئے تیرِ نگاہِ ناز کے
دیدنی ہیں معجزے حسنِ کرشمہ ساز کے

لاکھ پردوں میں سہی جلوے نگاہِ ناز کے
سامنے آجائیں گے چشمِ نظارہ باز کے

تھا یہ جلووں کا تقاضا یا نظر کا مقتضا
خود بخود اُٹھنے لگے پردے حریمِ ناز کے

گلستاں والوں نے جب کر ہی دیا بے آشیاں
حوصلے دیکھیں نہ کیوں ہم بھی پرِ پرواز کے

کیوں ازل سے آج تک گردش میں ہیں ارض و سما
کیا اشارے ہیں یہ تیری چشمِ دُنیا ساز کے

ہو چکے اکمل بہت ہم رازداری سے خراب
چاک کرنے ہی پڑیں گے اب تو پردے راز کے

۵۵

کر رہا ہے کیا جنونِ فتنہ ساماں دیکھئے
دھجیاں خود ہو چلے جیب و گریباں دیکھئے

دوش پر بکھری ہے پھر زلفِ پریشاں دیکھئے
پھر ہوئے میری پریشانی کے ساماں دیکھئے

زندگی تو ہم سے پہلے ہی بہت بیزار تھی
موت بھی ہم سے ہوئی جاتی ہے نالاں دیکھئے

ایک دل پہلو میں ہے اور اس میں لاکھوں داغ ہیں
رہروانِ عشق کی منزل کا ساماں دیکھئے

وعظ سُن کر حضرتِ ناصح سے اکمل نے کہا
آپ بھی میری طرح ہو کر پریشاں دیکھئے

(٥٦)

محبت میں بہر لہجہ زباں کچھ اور کہتی ہے
یہاں کچھ اور کہتی ہے، وہاں کچھ اور کہتی ہے

بذاتِ خود تسلّی دینے والے کچھ کہے جائیں
مریضِ غم کی جانِ ناتواں کچھ اور کہتی ہے

محبّت کے بہت قصّے زمانے نے سُنے ہوں گے
مرے ذوقِ طلب کی داستاں کچھ اور کہتی ہے

زبان و دل میں یہ کیا تفرقہ ڈالا محبّت نے
کہ دل کچھ اور کہتا ہے زباں کچھ اور کہتی ہے

کسی کو ناز ایسی زندگی پر ہو تو ہو اکملؔ
ہماری منزلِ عمرِ رواں کچھ اور کہتی ہے

ترے رُخ سے پلٹ کر جب نظر ناکام آتی ہے
جو صبح زندگی ہوتی ہے بن کر شام آتی ہے

متاعِ دردِ دل کی بات کیا ہے اے معاذاللہ
محبت میں یہی اک چیز ہے جو کام آتی ہے

حدیثِ دل میں ہوتا ہے اضافہ بابِ تازہ کا
تمھاری یاد لے کر اِک نیا پیغام آتی ہے

دیارِ عشق میں کیا کام ہے صبحِ مسرت کا
گزر جاتی ہے جب اِک شام تو اِک شام آتی ہے

میرے دل کو متاعِ رائیگاں کیوں لوگ کہتے ہیں
یہی اِک کام کی شے ہے جو اکثر کام آتی ہے

تقاضے سے تقاضے شوقِ مے نوشی کے ہوتے ہیں
طبیعت ہے کہ رُکتی ہی نہیں جب شام آتی ہے

کسی کی یاد کا تو ذکر ہی کیا ہے یہاں اکمل
خود اپنی یاد بھی ہم کو برائے نام آتی ہے

(۵۸)

غمِ اُلفت میں دل آئینہ ساماں ہوتا جاتا ہے
مری دُنیا کا ذرہ ذرہ حیراں ہوتا جاتا ہے
جنوں میں چاک چاک اپنا گریباں ہوتا جاتا ہے
یہ تھا اک راز در پردہ جو عُریاں ہوتا جاتا ہے
جنونِ عشق نے یارب یہ کیسے گُل کھلائے ہیں
مری نظروں میں ہر کانٹا گُلستاں ہوتا جاتا ہے
بدلتی جا رہی ہے کائناتِ دل محبت میں
یہ گھر وقفِ خیالِ روئے جاناں ہوتا جاتا ہے
وفورِ گریہ میں اکمل متاعِ دل نہ بہہ جائے
کہ ہر اشکِ ندامت موجِ طوفاں ہوتا جاتا ہے

(۵۹)

کب تک خلاف مجھ سے دورِ زماں رہے گا

نامہرباں کہاں تک نامہرباں رہے گا

آباد دل کی دُنیا ہے آرزو کے دم سے

جب آرزو نہ ہوگی پھر دل کہاں رہے گا

نام و نشاں کی خاطر ایمان کھونے والے

کس کا نشاں رہا ہے کس کا نشاں رہے گا

آواز دے رہے ہوں جب خودکسی کے جلوے

پھر بھی نظر کا پردہ کیا درمیاں رہے گا

جس گُلستاں پہ ہردم گلچیں کے ہوں مظالم

وہ گُلستاں بھی کہئے کیا گلستاں رہے گا

جس شاخِ گُل پہ نظریں صیّاد کی نہ پہونچیں

اُس شاخِ گل پہ اپنا آب آشیاں رہے گا

جس دل کو غم نہیں کچھ عیش وطرب کا اکملؔ

وہ دل جواں رہے وہ دل جواں رہے گا

(۶۰)

وہ اشکِ خوں جو آنکھ سے دامن پہ آگیا
میری حدیثِ عشق کو رنگیں بنا گیا
جب سے خدنگِ یار نشانہ بنا گیا
یہ دل نہ جانے کون سے عالم میں آ گیا
ایسی نگاہِ مست سے کوئی پلا گیا
بیگانہ ہر خیالِ جہاں سے بنا گیا
پُرسانِ حال اور زمانے میں کون ہو
خود تم سے جب نہ حالِ ہمارا سُنا گیا
کچھ اس طرح وہ آئے سرِ بزم بے حجاب
اک اِنقلاب ہوش کی دُنیا میں آ گیا
ساقی شراب لا ترے جام و سبو کی خیر
وہ ابر میکدے پہ دھواں دھار چھا گیا

ہرچند ملتفت رہی دُنیائے عشوہ ساز
میں ایک ہوشیار کہ دامن بچا گیا
ایسی پلائی ساقیٔ روشن ضمیر نے
اِک جامِ مے میں رازِ دو عالم کو پا گیا
میرا کمالِ مشقِ تصوّر تو دیکھئے
گویا وہ حور وش مرے پہلو میں آ گیا
اکمّلؔ نہ ایک حرف بھی ثابت ہوا غلط
لکھا گیا جو روزِ ازل وہ لکھا گیا !!!

(۶۲)

منتخب ہے وہی ٹکڑا مرے افسانے کا
جس میں ہے ذکر مرے خود سے گذر جانے کا
کیا جنوں جوش پہ آیا ترے دیوانے کا
شور انگیز ہر اک ذرّہ ہے ویرانے کا
عکس انداز ہوا جلوۂ ساقی جب سے
ایک عالم ہی نیا ہے مرے پیمانے کا
بیخودی واقفِ اسرارِ خودی ہو۔ توبہ
عشق میں ہوش کہاں ہوش میں آجانے کا
ہاتھ ہے چاکِ گریباں پہ نظر سوئے فلک
آج کیا جانئے کیا عزم ہے دیوانے کا

ہائے وہ میّت بیکس جو اُٹھائی نہ گئی
ہائے وہ سوز جو اِک راز تھا پروانے کا

انگلیاں جیب و گریباں سے اُلجھ جاتی ہیں
راز افشا کہیں ہو جائے نہ دیوانے کا

گونجتی ہے مری آواز شکستِ دل کی
اب بھی آباد ہر اِک ذرّہ ہے ویرانے کا

زندگی پھر اُسی ماحول میں لائی اکملؔ
عشق عنوان جہاں تھا مرے افسانے کا

(۶۴)

ہر چند کہ ہر رنج محبت میں اُٹھایا
لب پر نہ مگر حرفِ شکایت کبھی آیا
ہر تیرِ ادا اُن کی نگاہوں سے جو آیا
ارمان کی صورت وہ مرے دل میں سمایا
وحشت میں بھی گو ہاتھ گریباں پہ نہ آیا
اِک راز مگر چھپ نہ سکا لاکھ چھپایا
بیجا ہے جو ہم چرخِ ستمگار کو کوسیں
ہم نے وہی دیکھا جو ہمیں دل نے دکھایا
دِل کے یہی دو حرف رہے زیست کا حاصل
دل کیا مرے پہلو میں بنایا ہے خدایا

سرمست نظر آئیں دو عالم کی فضائیں
جب نغمۂ پُر کیف مرا رنگ پہ آیا
روکے نہ کسی طرح رُکا بخیۂ وحشت
پرزُرے ہوا دامن جو گریباں کو بچایا
اُس شاخِ گلِ تر پہ گری ٹوٹ کے بجلی
جس شاخِ گلِ تر پہ نشیمن تھا بنایا
جب وقت پڑا کام نہ آیا کوئی اکمل
ہوتا ہے بُرے وقت میں اپنا بھی پرایا

(۶۵)

جو کمال اب تک نہیں دیکھا کسی کامل کے پاس
آنکھ ہو تو دیکھ لے انسان اپنے دل کے پاس

ایک دل ہے اور لاکھوں داغہائے آرزو
کچھ نہ ہونے پر بھی کیا دولت ہے اہلِ دل کے پاس

دیدنی ہے عشق میں یہ عالمِ اُمید و یاس
اِک قدم منزل سے کوسوں دُور اِک منزل کے پاس

وہ مُرادوں کا سفینہ بھی ہے کتنا نامُراد
غرق ہو جائے جو بے طوفان ہی ساحل کے پاس

جادۂ ترک و طلب سے جب گزر جاتا ہے دِل
ہر قدم اپنا نظر آتا ہے پھر منزل کے پاس

وہ سرِ محفل ابھی بے پردہ آئے بھی نہ تھے
'دُور باش اے ہوش' کا اک شور تھا محفل کے پاس

تھی تماشہ میری غرقابی پئے اربابِ دہر
دیکھنے والے تھے کچھ ساحل پہ کچھ ساحل کے پاس

ہو ہی جاتی ہے بالآخر کارگر تاثیرِ شوق
آ ہی جاتا ہے مسافر ایک دن منزل کے پاس

خود ہی لے جائے گی اکملؔ منزلِ مقصود تک
وہ فروغِ عشق کی تنویر جو ہے دل کے پاس

(٦٦)

مجھ کو اے داورِ محشر تری رحمت کی قسم

میں گنہگار نہیں، ہاں میں گنہگار نہیں

عشق کی حد سے گزر کر میں وہاں ہوں کہ جہاں

دودِ فریاد نہیں، آہِ شرر بار نہیں

جس پہ پڑ جائے تری میکدہ بردوش نظر

اُس کو شغلِ مے و مینا سے سروکار نہیں

بندگی ہم سے تو اے سطوتِ نمرود نہ چاہ

ہم تری جھوٹی خدائی کے طرفدار نہیں

میکدے کی ہے نرالی ہی لُغت اے اکمل

بزمِ رنداں میں جو ہشیار ہے ہشیار نہیں

زبانِ حال سے کہہ دیں گے آرزو کیا ہے
پیامِ عشق بہ عرفانِ گفتگو کیا ہے

ہیں یوں تو دیکھنے والے ترے بہت اے دوست
مری نگاہ سے دیکھے کوئی کہ تو کیا ہے

بشکلِ انجم و مہتاب و مہرِ عالمتاب
جو تو نہیں تو نگاہوں کے روبرو کیا ہے

خلوص و عجز ہے انساں کی آبرو اکملؔ
خلوص و عجز نہیں ہے تو آبرو کیا ہے

(۶۸)

رستے کی ملاقات ملاقات ہی کیا ہے
جی بھر کے نہ ہو بات تو پھر بات ہی کیا ہے
کیوں میکدۂ عشق میں ہوں ہوش کی باتیں
با ہوش ہے جو رندِ خرابات ہی کیا ہے
ہے عین پریشانئ دل بزم خیالات
اور اس کے سوا بزم خیالات ہی کیا ہے
تو برقِ تجلّیٰ سے ملائے گا نگاہیں
اے دل تری ہستی تری اوقات ہی کیا ہے
ہونے کو تو دُنیا میں سخن سنج ہیں لاکھوں
اس شاعرِ اکملؔ کی مگر بات ہی کیا ہے

(۶۹)

آندھیاں بن کے اُٹھے ولولے دیوانوں کے
خود بخود ٹوٹ گئے تار گریبانوں کے

یہ نظارے ہیں امیروں کے شبستانوں کے
دَور چلتے ہیں چھلکتے ہوئے پیمانوں کے

اہلِ دل شرم سے آب آب ہوئے جاتے ہیں
جو کئے ہم نے وہ تھے کام نہ اِنسانوں کے

ہائے کس راہِ پُر آشوب میں رکھا ہے قدم
حوصلے پست ہوئے جاتے ہیں دیوانوں کے

غیر ممکن ہے گلستاں میں ٹھکانا اکمل
آج بدلے ہوئے تیور ہیں نگہبانوں کے

(۷۱)

یہ تیرا ہی تو چرچا ہے تماشا دیکھنے والے
جہاں میں اپنے دیوانے کو رسوا دیکھنے والے

کلیجہ تھام لینا دل کو بھی تھامے ہوئے رہنا
سنبھل کر دیکھنا اے زخم دل کا دیکھنے والے

وفورِ اشکِ غم میں بہہ نہ جائے دل کی دُنیا ہی
ہر اشکِ غم میں اِک طوفان برپا دیکھنے والے

پری ہو۔ حور ہو۔ بُت ہو۔ خُدا ہو کوئی ہو لیکن
کسے دیکھیں ترا نقشِ کفِ پا دیکھنے والے

نیازِ عشق میں بھی حسن کے سو ناز پنہاں ہیں
مجھے دیکھیں باندازِ تماشا دیکھنے والے

خود اپنی کشتیِ عمرِ رواں طوفاں میں ہے اکمل
سہارا کیا کسی کو دیں سہارا دیکھنے والے

(۷۰)

اس دنیا میں اے دل تیرا قصہ پروانے والا ہے
دیوانے تیرا کون جہاں میں سوگ منانے والا ہے

اے طالبِ دید سنبھل بھی جا اب دیدہ و دل کی خیر نہیں
پردوں میں نہاں جو تھا پردوں سے باہر آنے والا ہے

بربادِ محبت ہو کر بھی یہ راز نہ ہم سمجھے اب تک
کیوں دل کو محبت ہے اُس سے جو دل کو ستانے والا ہے

اللہ رے طلسمِ ذوقِ نظر کیا خوب ہے دیدہ و دل پہ اثر
بس آنکھ اُسی پر اُٹھتی ہے جو دل کو ستانے والا ہے

آغازِ محبت عینِ جنوں، انجامِ محبت عینِ سکوں
یہ آگ لگانے والا ہے وہ آگ بجھانے والا ہے

جب دل ہی نہ ہو پہلو میں تو پھر احساسِ غمِ اُلفت کیسا
اے اکملؔ عشق میں دل کے سوا کچھ کام نہ آنے والا ہے

۷۲

جس کا ڈر تھا سامنے آخر وہ بات آ ہی گئی
دن بڑی مشکل سے گزرا تھا کہ رات آ ہی گئی

رفتہ رفتہ اہلِ دُنیا کی نظر کے سامنے
داستانِ دل برنگِ واقعات آ ہی گئی

بن گیا دل مرجعِ دردو غم و رنج و الم
جزو کے حصے میں بھی کل کائنات آ ہی گئی

چارہ گر دردِ محبت میں ہمارا کون تھا
یادِ جاناں بن کے عینِ التفات آ ہی گئی

بیخودی طاری کچھ ایسی ہو گئی اکمل پہ آج
راز میں اب تک جو تھی لب پر وہ بات آ ہی گئی

۷۳

ساقی نہ ہو جس میخانے میں حاصل اس میخانے سے کیا
جو بادۂ عشق سے خالی ہو اس دل کے پیمانے سے کیا

دیوانے کی دُنیا ہے جُدا اِس جھوٹی دنیا والوں سے
دیوانے کو دُنیا سے کیا دُنیا کو دیوانے سے کیا

ایّامِ جوانی آتے ہی مسرور ہوئیں کافر آنکھیں
اللہ رے بادۂ مستی سے لبریز ہیں پیمانے سے کیا

جو عشق میں دل پر گذری ہے عشاق زباں پر کیا لائیں
جو دل پہ اور گراں گزرے وہ قصہ دُہرانے سے کیا

تو لاکھ چھپے پردوں میں تو کیا ہم بھی تو نگاہیں رکھتے ہیں
اے جانِ دو عالم ہوتا ہے پردوں میں چھپ جانے سے کیا

کعبہ ہو کہ بُت خانہ دونوں منزل ہیں شیخ و برہمن کی
اکمل ہم حسن پرستوں کو کعبے اور بُت خانے سے کیا

(۷۴)

کچھ تم پہ نہیں موقوف کوئی دنیا میں ہمارا ہو نہ سکا
تم ہم سے کنارا کر بیٹھے ہم سے تو کنارا ہو نہ سکا

اِس دَور میں اور سکونِ دل اے اہلِ وطن توبہ توبہ
مرنے کے بہانے لاکھ بنے جینے کا سہارا ہو نہ سکا

اے رہروِ منزل ایسے میں رہبر سے شکایت کیا معنی
جب جادۂ سخت محبت کا خود تجھ سے گوارا ہو نہ سکا

ہم عشق کے ماروں کی قسمت وہ سامنے بھی آئے جو کبھی
کمبخت نگاہیں اُٹھ نہ سکیں دم بھر بھی نظارا ہو نہ سکا

اے دوست متاعِ دل تو کیا ہم عشق میں سب کچھ کھو بیٹھے
اِک سانس ذرا سا باقی تھا وہ بھی تو ہمارا ہو نہ سکا

کیا اس میں خطا چارہ گر کی تقدیر ہی دھوکا دے بیٹھی
وہ درد ہمارے دل میں تھا کچھ جس کا چارا ہو نہ سکا

کیا پاسِ ضبطِ محبت تھا آغازِ محبت میں اُن کو
دل سے تو اشارے لاکھ گئے آنکھوں سے اشارا ہو نہ سکا

تقدیر عمل سے بنتی ہے ہمت کا سہارا ہوتا ہے
آہوں سے تو اے اکملؔ روشن قسمت کا ستارا ہو نہ سکا

(۷۵)

جُھکا جُھکا کے جبینِ نیاز دیکھ چکا
ترا نصیب دلِ غم نواز دیکھ چکا

جو حُسن و عشق کے ناز و نیاز دیکھ چکا
زمانے بھر کے نشیب و فراز دیکھ چکا

خیالِ یار سے بھی کچھ تسلّیاں نہ ہوئیں
یہ خواب بھی دلِ مہماں نواز دیکھ چکا

تجلیاتِ دو عالم دکھائیں دل نے مجھے
کمالِ صنعتِ آئینہ ساز دیکھ چکا

تمھارا لطف و کرم، اِلتفاتِ مہر و وفا
یہ سب نوازشیں بندہ نواز دیکھ چکا

کوئی ہے جام بہ لب تو کوئی ہے تشنہ دہن
حقیقتِ نگہِ اِمتیاز دیکھ چکا

ہلاکِ شعبدۂ آسماں نہیں اکملؔ
کرشمۂ نگہِ فتنہ ساز دیکھ چکا

نظمیں

رباعی

حالِ دلِ ناکام نظر آتا ہے
وقفِ غم و آلام نظر آتا ہے
کیا ہو گیا ساقی ترے میخانے کو
مدت میں کوئی جام نظر آتا ہے

بسنت

لیں کروٹیں وہ اشہبِ لیل و نہار نے
فطرت چلی ہے رنگِ جہاں کو نکھارنے
اُلٹا نقاب رُخ سے عروسِ بہار نے
جلوہ دکھا دیا کسی رنگیں عذار نے
ہر شاخ ہر شجر کی ادائیں بدل گئیں
پلٹا وہ رُخ فضا نے ہوائیں بدل گئیں
ہر پھول ہر کلی میں لطافت کا جوش ہے
ہر نخلِ گلستانِ جہاں سبز پوش ہے
صحنِ چمن میں بادِ صبا مے فروش ہے
غرقِ مئے نشاط ہے جس کو بھی ہوش ہے
ہر سمت فیضِ ساقیٔ محبوب عام ہے
ہر چشم مستِ بادۂ گلگوں کا جام ہے

صہبائے رنگ و بو میں ہے ڈوبا ہوا جہاں

موجِ ہوا میں کیفِ مے ناب ہے رواں

ایسی بہارِ خلد میں رنگینیاں کہاں

جو گلستانِ ہند کے پھولوں میں ہیں نہاں

ہر ذرہ آفتاب ہے اس سرزمین کا

کیا حُسن لاجواب ہے اس نازنین کا

دنیا نہیں یہ گلشنِ جنت ہے ہُو بہو

ہر سمت ہے تلاطمِ امواجِ رنگ و بُو

ہر لب پہ مستیوں کے ترانے ہیں چار سُو

گانے لگے بسنت جوانانِ خوش گلو

بزمِ جہاں میں عیش و طرب کا ہجوم ہے

دیکھو جدھر بسنت کے آنے کی دھوم ہے

یہ دَور ہے عجیب سماں لاجواب ہے

احباب مے گسار میں شغلِ شراب ہے

ہر جام میں تجلیٔ صہبائے ناب ہے

ہر دل بقدرِ ذوقِ طلب فیضاب ہے

اُتنی ملی ہے مئے جسے جتنی امنگ ہے

اس حسنِ امتیاز پر ہر شخص دنگ ہے

ہے دیدنی جو رُخ پہ حسینوں کے نور ہے

جس ماہ وش کو دیکھئے وہ رشکِ حور ہے

مستانہ انکھڑیوں میں وہ کیف و سرور ہے

گویا نشے میں حسن کے خود حسن چور ہے

ہر ایک نازنیں ہے بسنتی لباس میں

مے جیسے زعفراں کی بھری ہو گلاس میں

برسات

جھومتا جھامتا برسات کا بادل آیا

میرے اُمڈے ہوئے جذبات کا بادل

دیکھتے دیکھتے وہ گرم ہوائیں بدلیں

گلشنِ ہستیٔ عالم کی فضائیں بدل

میکشو جام اُٹھاؤ وہ جوانی آئی

بال کھولے ہوئے برسات کی رانی آ

وہ کڑکتی ہوئی بجلی وہ گرجتا بادل

وہ فضاؤں کو سجاتا ہوا سجتا باد

بزمِ آفاق پہ ہونے لگی بوندا باندی

اس طرح جیسے برستی ہو فلک سے چان

سازِ ہستی پہ وہ تانیں سی اُڑاتا آیا

گوشِ مشتاق کو ملہار سُناتا آ

جوشِ باراں ہے کہ بجتا ہے مغنّی کا ستار
یا کسی شوخ کی چھاگل کی ہے پیہم جھنکار

یہ فضائیں، یہ ہوائیں، یہ گھٹائیں، یہ سماں
دیر کیا پینے پلانے میں ہے اے پیرِ مغاں

کھولدے ساقیٔ میخانہ درِ میخانہ
مۓ گلگوں سے ہو لبریز مرا پیمانہ

جو غمِ زیست سے بیگانہ بنادے مجھ کو
مۓ سرجوش کا وہ جام پلادے مجھ کو

پھر کہاں ہائے یہ برسات کی گھنگھور گھٹا
پھر کہاں کیفِ جنوں خیز سے معمور ہوا

پھر یہ ساون کی جھڑی اور یہ پھر ابر کہاں
رند سے ہوتا ہے ایسے میں بھلا صبر کہاں

خس و خاشاک پہ پھر آئی جوانی کی ترنگ
دیدنی پھر ہے بہارِ گل و گلزار کا رنگ

انوارِ سحر

صبح دم ہر روز مشرق کی طرف زیرِ فلک
قرمزی سے رنگ کی ہوتی ہے پیدا اِک جھلک
یہ گلابی سی فضا کتنی سُرور انگیز ہے
اِس طرف سے جو ہوا آتی ہے کیف آمیز ہے
ہو رہا ہے ضو فشاں کیا حُسنِ کامل کا جمال
کیا جنونِ سحر ساماں کا یہ ہے کوئی کمال
جلوۂ فطرت سمٹ آیا ہے کیا اس رنگ میں
ہے نمایاں پرتوِ نورِ خدا اس رنگ میں
کون اِس ظلمت کدے میں آ رہا ہے ضوفشاں
نُور سے معمور ہوتا جا رہا ہے آسماں
ہو گیا بیدار شاید شاہِ خاور خواب سے
بھر دیا سبزے کا دامن گوہرِ نایاب سے

نازنینوں پہ حسینوں پہ جوانی آئی
آئی پھر ماہ جبینوں پہ جوانی آئی
کیفِ نظارہ سے ہیں اہلِ نظر متوالے
گلستانوں میں حسینوں نے ہیں جھولے ڈالے
یہ سماں وہ ہے جو ہر روح کو سرشار کرے
دل کے سوتے ہوئے جذبات کو بیدار کرے
یہ سماں باعثِ زینت ہے شبستانوں کو
عین راحت ہے تڑپتے ہوئے ارمانوں کو
یہ سماں گلشنِ جنّت کی سراپا تصویر
یہ سماں وہ ہے کہ جس کی نہیں عالم میں نظیر
یہ سماں وہ ہے کہ کہئے جسے دہقاں کی امید
یہ سماں وہ ہے کہ کہتے ہیں جسے روکشِ عید
رنگ رلیوں کا یہ دن عیش کی یہ رات نہ ہو
زندگی کیف سے خالی ہے جو برسات نہ ہو

کھیلتی پھرتی ہے بادِ صبحدم اشجار سے
چومتی پھرتی ہے پتّے پتّے کو کس پیار سے
ہر کلی ہر پھول کا شبنم سے منہ دُھلنے لگا
یادِ حق میں غنچے غنچے کا دہن کھُلنے لگا
چاند کی تنویر کچھ موہوم سی ہونے لگی
اور تاروں کی بھی ضو معدوم سی ہونے لگی
کیا اسی منظر کو انوارِ سحر کہتے ہیں لوگ
کیا اسی منظر سے مجھ کو بے خبر کہتے ہیں لوگ
گو زمانے کی نظر میں اکملِ ناداں ہوں میں
ناز لیکن جس پہ فطرت کو ہے وہ انساں ہوں میں

حالِ دل قابلِ تسکین بنانا ہے ابھی

دیش کو رنج و مصیبت سے چھڑانا ہے ابھی
ہر طرح قوم کی بگڑی کو بنانا ہے ابھی

کتنے ہی مرحلے ہیں جو ہمیں طے کرنے ہیں
ہر دلِ زار کو تسکین دلانا ہے ابھی

دیر سے راہِ محبّت جو بھلا بیٹھے ہیں
رُخ انھیں راہِ محبّت کا دکھانا ہے ابھی

جس سے ہر ذرہ وطن کا نظر آئے مہ و مہر
منظرِ عام پہ اُس شان کو لانا ہے ابھی

کوئی بھی ڈھنگ ہو تدبیر تو جاری ہی رہے
اپنی بگڑی ہوئی قسمت کو بنانا ہے ابھی

پیٹ کی آگ سے ہے لاگ دلوں میں پیدا
اس بھڑکتے ہوئے شعلے کو بجھانا ہے ابھی

ملک کے طبقۂ زردار کو مزدوروں کو
اِک نیا گیت محبّت کا سُنانا ہے ابھی
ہر طرف مہر و محبّت کی حکومت ہو جائے
اپنے اِس خواب کو سچ کر کے دکھانا ہے ابھی
جن ستاروں سے بڑھے انجمنِ دہر کی شان
آسمانوں سے انھیں توڑ کے لانا ہے ابھی
اپنے ایثار سے حاصل جو ہوئی ہے نعمت
ہر طریقہ سے ہمیں اُس کو بچانا ہے ابھی
خانہ بر دوش جو پھرتے ہیں مصیبت کے شکار
دیش میں اپنے انھیں پھر سے بسانا ہے ابھی
کہیں تسکین کی صورت نہیں کوئی اکمل
حالِ دل قابلِ تسکین بنانا ہے ابھی

نئی دُنیا کی تعمیر

ہر خطۂ زمیں کو اس طرح کچھ سجائیں
دوزخ بھی ہو تو اُس کو جنّت نشاں بنائیں

غمہائے زندگی کو بدلیں مسرتوں سے
صدیاں جو تھیں سنہری واپس پھر ان کو لائیں

مہر و وفا بڑھا کر بغض و حسد مٹا کر
دل جن سے پھٹ چکا ہے قصّے وہ بھول جائیں

اب کام کا نہیں ہے دستور وہ پُرانا
آئینِ زندگانی مل کر نیا بنائیں

جھگڑا اگر کہیں ہو بڑھنے سے اس کو روکیں
دشمن نہ خواب میں بھی فتنے اُٹھانے پائیں

ہر سازِ دل پہ ہمدم پھر گیت ہوں خوشی کے
بھولے ہوئے فسانے دُنیا کو پھر سُنائیں

خوف و خطر کسی کا دل میں نہ ہو کسی کے

ایسی روش بنائیں ایسا چلن بنائیں

بے جا کسی سے اڑنا ناحق کسی سے لڑنا

حق بات پر بگڑنا ہم لوگ بھول جائیں

ہوں قہقہوں سے پیدا لمحاتِ شادمانی

ایّامِ زندگانی ہر سمت مسکرائیں

ایسی بہار آئے آ کر جو پھر نہ جائے

کر دیں دِلوں کو رقصاں مستی بھری فضائیں

ہر سمت گونج اُٹھے تیرا یہ گیت اکمل

مستی سے جھوم اُٹھیں جو لوگ اِس کو گائیں

اُمیدیں

جہاں سے دُور غم کا نام ہو گا
جہاں آرام ہی آرام ہو گا
جہاں امن و اَماں کا دَوَر ہو گا
جہاں نابود ذکرِ جوَر ہو گا
جہاں ہر نوجواں جاں باز ہو گا
جہاں حُبّ وطن پر ناز ہو گا
جہاں کے رہنے والے شاد ہونگے
جہاں اہلِ نفس آزاد ہوں گے
جہاں گونجیں گے اُلفت کے ترانے
جہاں ہوں گے محبّت کے فسانے
جہاں ہو گی طبیعت میں جوانی
جہاں بھرپور ہو گی زندگانی

جہاں کے بسنے والے نیک ہونگے

جہاں ہندو مسلماں ایک ہوں گے

جہاں آزارِ جاں کوئی نہ ہو گا

جہاں صرفِ فغاں کوئی نہ ہو گا

جہاں انسان ہی انسان ہوں گے

جہاں سب صاحبِ ایمان ہوں گے

جہاں ہر شخص فرض آگاہ ہو گا

جہاں ہر ذرّہ مہر و ماہ ہو گا

جہاں دریا مسرّت کے بہیں گے

جہاں بندے خدا کے خوش رہیں گے

جہاں ہو گی بہارِ جاودانی

جہاں انگڑائیاں لے گی جوانی

جہاں قلبِ بشر پُر نور ہو گا

جہاں کا ذرّہ ذرّہ طور ہو گا

جہاں ہر صبح نیک انجام ہو گی
جہاں دل کش سلونی شام ہو گی
جہاں جنّت سے آئیں گی بہاریں
جہاں ہر سمت چھائیں گی بہاریں
جہاں بزمِ فضا پُر کیف ہو گی
جہاں موجِ صبا پُر کیف ہو گی
جہاں یہ سب سر و سامان ہو گا،
مرا پیارا وہ ہندوستان ہو گا

انقلاب

وہ زلزلہ ہوں جو میں چرخ کی ہلا دوں گا
نظامِ دہر میں اِک تہلکہ مچا دوں گا
وہ گُل ریاضِ جہاں میں نئے کھلا دوں گا
بطرزِ نو چمنِ دہر کو سجا دوں گا
کسی کے طالعِ خفتہ کو میں جگا دوں گا
کسی کی قسمتِ بیدار کو سُلا دوں گا
غمِ جہاں کو بدل دوں گا عیش و راحت سے
جہانِ عیش کو ماتم کدہ بنا دوں گا
مرے عتاب سے واقف نہیں ابھی دُنیا
میں کیا ہوں، کون ہوں دُنیا کو یہ بتا دوں گا
نہ ہو سکیں گے مظالم خدُا کے بندوں پر
جہاں سے ظلم کا نام و نشاں مٹا دوں گا

یہ شرق و غرب نگاہوں میں ہوں گے زیر و زبر
قیامتوں کا سماں خلق کو دکھا دوں گا

مثالِ خطۂ دوزخ ہے جس قدر یہ جہاں
اُسی قدر اِسے جنّت نشاں بنا دوں گا

جنونِ ظلم تری ہوشیاریاں کب تک
ٹھہر میں ہوش ٹھکانے ترے لگا دوں گا

جہاں ہے نشۂ پندار اہلِ دولت کو
بڑے بڑوں کی وہاں چوکڑی بُھلا دوں گا

جہانِ تیرہ سے کر دوں گا ظلمتیں معدوم
تجلّیات سے دُنیا کو جگمگا دوں گا

ستم شعار مجھے اضطراب کہتے ہیں
ستم رسیدہ مجھے انقلاب کہتے ہیں

کہو انسانیت کی خاک اڑانا زیب دیتا ہے
بہو انساں کو انساں کا بہانا زیب دیتا ہے
کہو پُرزے محبت کے اُڑانا زیب دیتا ہے
بزرگوں کے چلن کو بھول جانا زیب دیتا ہے
کہو شرم و حیا کو بیچ کھانا زیب دیتا ہے
رہِ اخلاق سے آنکھیں چرانا زیب دیتا ہے
کہو مذہب کے غمخوار و کہو ملّت کے دیوانو
وقارِ مذہب و ملّت گھٹانا زیب دیتا ہے
بتاؤ تو ہے کس مذہب میں جائز خونِ انساں کا
بتاؤ تو یہ مسلک ہی کہاں ہے اہلِ ایماں کا
اگر کچھ زورِ بازو آزمانا ہے اِدھر آؤ
کلائی توڑ دو دریا کی طوفانوں سے ٹکراؤ
اگر ہمّت ہے تو قیدِ غلامی سے اماں پاؤ
جو دل سینے میں رکھتے ہو تو نورِ امن پھیلاؤ

اہلِ وطن سے

کہو کیا مذہبی جھگڑے اُٹھانا زیب دیتا ہے
کہو قیدِ غلامی کو بڑھانا زیب دیتا ہے
کہو بیزار و بیکس کو ستانا زیب دیتا ہے
کہو کمزور سے زور آزمانا زیب دیتا ہے
کہو معصوم بچّوں کو رُلانا زیب دیتا ہے
کہو کیا عورتوں پر ہاتھ اُٹھانا زیب دیتا ہے
کہو کیا بے بسوں پر ظلم ڈھانا زیب دیتا ہے
چھُری مُفلس کی گردن پر چلانا زیب دیتا ہے
کہو گھر بار خود اپنا جلانا زیب دیتا ہے
تماشہ کیا یہ دُنیا کو دکھانا زیب دیتا ہے
کہو کیا راہ گیروں کو ستانا زیب دیتا ہے
نہتّوں کو جوانمردی دکھانا زیب دیتا ہے

ابھی کچھ بھی نہیں بگڑا نہ گھبراؤ نہ گھبراؤ

اٹھو ہمت کرو سب سر بکف میدان میں آؤ

نہ ٹھہرو دم نہ لو جبتک نہ تم آزاد ہو جاؤ

اگر انسان ہو بادِ مخالف سے نہ گھبراؤ

محبت سے تم اپنے بھائیوں کو راہ پر لاؤ

محبت کا زمانے بھر کو تم پیغام پہنچاؤ

کہ اُلفت ہی سے قائم یہ نظامِ بزمِ دوراں ہے

نہ ہو اُلفت تو اس عالم کا شیرازہ پریشاں ہے

ہستیِ موہوم

غیر ممکن جادۂ ہستی میں ہے صبر و شکیب
ہر قدم پر کھا رہا ہے رہروِ کتنے فریب
لمحہ لمحہ زندگانی کا فسوں انگیز ہے
ہر مقام زندگی گویا تحیّر خیز ہے
بالیقیں تسکین پا سکتا نہیں قلب تپاں
جب ہر اک انسان ہے صیدِ بلائے ناگہاں
دل اگر غم سے بچا یا رنج پہنچا جان کو
پیش آجاتی ہے آفت اک نہ اک انسان کو
موت کی زد میں ہیں سب ظالم بھی اور مظلوم بھی
ایک ہی مرکز پہ ہیں حاکم بھی اور محکوم بھی
آدمی کی زندگانی کا فنا انجام ہے
ہستیِ موہوم گویا ہستیِ ناکام ہے

یسیم و زر وجہِ سکونِ دل کبھی ہوتا نہیں

یہ دِیا ظلمت رُبائے زندگی ہوتا نہیں

چل نہیں سکتا غم و آلام پر انساں کا زور

جب کہ ہے دستِ اجل میں زندگی کی باگ ڈور

رو رہی ہے بیکسی ہر شوق ہر ارمان پر

ہر طرف سے اُٹھ رہی ہیں اُنگلیاں انسان پر

عقل کی امداد سے کرتا ہے انساں دوڑ دھوپ

وقت پل بھر میں بدل دیتا ہے لیکن رنگ روپ

ہائے جس دُنیا کا ہر شاہ و گدا ہو غم نصیب

ایسی دُنیا کی پھر اکملؔ کیوں نہ ہو حالت عجیب

پیامِ امن

اہلِ شر برسرِ پیکار نظر آتے ہیں
مضمحل امن کے آثار نظر آتے ہیں

خشمگیں دہر کے اطوار نظر آتے ہیں
ڈگمگاتے در و دیوار نظر آتے ہیں

قصرِ عالم کو تباہی سے بچائیں کیونکر
ہر طرف آگ لگی ہو تو بجھائیں کیونکر

گرگ پہنچے ہیں سرِ عرصہ گہہ جنگ و جدال
ظالموں کو نہیں دُنیا کی تباہی کا خیال

اُن کو معلوم نہیں دہر کا کیا ہوگا حال
ختم ہو جائے گا ان کا بھی غرورِ اقبال

دیدنی گلشنِ عالم کا وہ منظر ہوگا
خاک کے ڈھیر پہ ایک ایک گُلِ تر ہوگا

سب کے سب اہلِ دول نشۂ پندار میں ہیں

سیکڑوں فتنے نہاں لہجۂ گفتار میں ہیں

دل میں پُر کذب ارادے اسی رفتار میں ہیں

محوِ تیاریِ سامانِ شرر بار میں ہیں

ڈھونڈتے پھرتے ہیں کچھ عذر شرارت کیلئے

شغل یہ اصل میں دعوت ہے قیامت کیلئے

امنِ عالم کی حفاظت نظرانداز نہ ہو

فرضِ انساں کسی صورت نظر انداز نہ ہو

وقت آئے تو حقیقت نظر انداز نہ ہو

مسلکِ مہر و محبّت نظر انداز نہ ہو

یہی پیغام گیا ہند سے باہر لے کر

یہ جواہر گیا بھارت کا جواہر لے کر

قابلِ غور ہے یہ مسئلۂ خیر و شر

غور فرمائیں جو اقوامِ جہاں کے رہبر

کوئی حل اس کا نہیں اصل میں اس سے بہتر

سب کو حق جینے کا حاصل ہو جہاں میں یکسر

پھر کسی کو نہ کچھ اندیشہ نہ افتاد رہے

بچہ بچہ غم و آلام سے آزاد رہے

کرشن مراری

میرے گھنشیام مرے کرشن مراری پیارے
مادرِ ہند کی آنکھوں کے منوّر تارے
زندگی تلخ ہے اب ظلم و ستم کے مارے
ہم سے دیکھے نہیں جاتے ہیں یہ اب نظارے
پھر ہمیں ظلم سے آزاد کرانے آجا
لاج بھارت کی مرے شام بچانے آجا

تونے جامِ مئے توحید پلایا تھا ہمیں
تونے افکارِ دو عالم سے چھڑایا تھا ہمیں
تونے ہر مسئلہ گیتا کا سُنایا تھا ہمیں
نارِ دوزخ کے شراروں سے بچایا تھا ہمیں
اپنی مُرلی کی وہی تان سُنادے ہم کو
غم کی ہر قید سے بیگانہ بنادے ہم کو

مہرباں ہم پہ یہ چرخِ ستم ایجاد نہیں

ہم جو روتے ہیں تو سُنتا کوئی فریاد نہیں

کون سا ذرّۂ ہستی ہے جو برباد نہیں

تو نے وعدہ جو کیا تھا وُہ تجھے یاد نہیں؟

ناؤ منجدھار میں ہے شام سنبھالو آ کر

ڈوب جائیں نہ کہیں ہم کو بچا لو آ کر

جُز تمھارے نہیں جینے کا سہارا کوئی

جُز تمھارے نہیں دُنیا میں ہمارا کوئی

جز ہمارے بھی تمھیں اور پُکارا کوئی؟

تم نے سوچا بھی ہمارے لئے چارا کوئی؟

زندگی موت سے بدتر ہے ہماری دیکھو

اب تو بھارت میں چلے آؤ مُراری دیکھو

نند بابا کی قسم تم کو یشودھا کی قسم
تجھ کو مرلی کی قسم ہے تجھے رادھا کی قسم
ستیہ بھاما کی قسم ہے تجھے گیتا کی قسم
اپنے بھگتوں کی قسم تجھ کو سداما کی قسم

آؤ پھر ہند کو گل زار بنا دو آ کر
آگ اِس گھر میں لگی ہے جو بجھا دو آ کر

انتہائے غم و آلام ہوئی جاتی ہے
ختم اب ہستیِ ناکام ہوئی جاتی ہے
اُمت اب آپ کی بدنام ہوئی جاتی ہے
شام آجاؤ کہ اب شام ہوئی جاتی ہے

ڈوبنے والوں کو جینے کا سہارا تو ہے
دیدۂ اکملؔ ناشاد کا تارا تو ہے

بھگوان رام

کس کے سوزِ غم سے پُھنکتے جا رہے ہیں جسم و جاں
کس کی فرقت میں گھُلا جاتا ہے جسمِ ناتواں
کس کے دردِ ہجر میں ہوتا نہیں ضبطِ فغاں
کس مقدّس رہنما کا نام ہے وردِ زباں
کس کے دم سے ہے وطن کا ذرّہ ذرّہ آفتاب
کون تھا جس کا نہ پیدا ہو سکا اب تک جواب
راہ کس کی تک رہے ہیں دیدہ و دل آج تک
یاد میں کس کی ہے پھیکا رنگِ محفل آج تک
ڈھونڈتے ہیں کس کو ہم منزل بمنزل آج تک
کس کماں کش پر ہمیں ہے فخر حاصل آج تک
بے طرح چھلنی کیا تھا کس نے سینہ پاپ کا
کس کے ہاتھوں نے ڈبویا تھا سفینہ پاپ کا

کون وہ صہبا کشِ پیمانۂ آلام تھا
کون اِس درجہ اسیرِ گردشِ ایام تھا
دشت پیمائی یہ چودہ سال کس کا کام تھا
کس کا ہر اعجاز اِک تازہ ترین پیغام تھا
کون اُٹھا تھا دہر سے ظلمت مٹانے کیلئے
قیدِ غم سے حق پرستوں کو چھڑانے کیلئے
عزم کس کا تھا مٹانا ظلم کی بنیاد کو
کر دیا مغلوب کس نے ہر ستم ایجاد کو
دیکھ کر کس نے وطن کی حالتِ برباد کو
ڈھا دیا راون کے قصرِ جور و استبداد کو
کس کے سینے میں نہاں تھی گرمیٔ حُبِّ وطن
کس نے ہنس ہنس کر اُٹھائے رنج و غم فکر و محن

جو سراپا دھرم کی مُنہ بولتی تصویر تھا
جو سراسر حُسنِ عالم گیر کی تنویر تھا
صاحبِ تدبیر تھا جو مالکِ تقدیر تھا
جس کے نقشِ پا کا ہر ذرّہ عجب اکسیر تھا
دیوتا بھی آج تک جپتے ہیں جس ہستی کا نام
یہ وہ ہے مریادا پرشوم جسے کہتے ہیں رام

شاعرِ اعظم تلسی داس

اے جہانِ شاعری کے بادشاہِ بے مثال
محسنِ اہلِ نظر اہلِ سخن اہلِ کمال
تیرے دل میں رام ہی کا تو ہمیشہ تھا خیال
سامنے تیرے تھا بے پردہ رُخِ حسن و جمال
زندگی تیری سراپا حاصلِ ادراک تھی
تیری ہستی ہر گناہِ زندگی سے پاک تھی
صانعِ قدرت نے بخشا تھا تجھے ایسا دماغ
تُو نے روشن کر دیا عالم میں عرفاں کا چراغ
رام کی فرقت کے غم میں تیرا دل تھا داغ داغ
درد نے بخشا تجھے رازِ دو عالم کا سراغ
راگ وہ تو نے سُنایا زندگی کے ساز پر
جھوم اُٹھتا ہے زمانہ جس کے ہر انداز پر

کھیلتا تھا تو بلائے گردشِ ایام سے

روحِ نو پائی ہے دنیا نے ترے پیغام سے

تھا ترا پیمانۂ دل پُر مئے الہام سے

زندگی تیری مبّرا تھی غم و آلام سے

جانے کس دُھن میں کہا تو نے فسانہ رام کا

بج گیا ڈنکا زمانے بھر میں تیرے نام کا

ڈگمگاتا تھا سفینہ چار سو طوفان تھا

دامِ گردابِ بلا میں سارا ہندوستان تھا

ڈوبنے والوں کے بچنے کا نہ کچھ امکان تھا

جو بشر تھا موت سے پہلے ہی وہ بے جان تھا

تو نے وہ غفلت شکن نغمہ سُنایا قوم کو

ناخدا بن کر رُخِ ساحل دکھایا قوم کو

تیری رامائن دکھاتی ہے حق و باطل کی جنگ

یعنی اہلِ کفر و اہلِ شر سے اہلِ دل کی جنگ

بحرِ ہستی میں ہر اک طوفان سے ساحل کی جنگ

سرفروشانِ وطن سے خنجرِ قاتل کی جنگ

زندگی کا فلسفہ تو نے کہا اس ڈھنگ سے

پا ہی لیتا ہے بشر راہِ نجات اس جنگ سے

اُف یہ پروازِ تخیل اُف یہ اندازِ بیاں

ہاں حقیقت کی حقیقت داستاں کی داستاں

تو نے آساں کر دیا ہر عقدۂ رازِ نہاں

رازِ پنہاں کر دیا تو نے اشاروں میں عیاں

تجھ کو ہر ذرّہ نظر آیا مثالِ آفتاب

تیری نظروں کا نہ پیدا ہو سکا اب تک جواب

سرنگوں ہے مدّتوں سے پرچمِ شعر و سخن
اُٹھ گئے ہندوستاں سے ماہرینِ علم و فن

اب گرفتارِ بلا ہے انجمن کی انجمن
مل سکے روٹی نہ زندوں کو نہ مردوں کو کفن

پھر جہاں میں چارہ سازِ ملک و ملّت بن کے آ
پھر زمانہ کو فسانہ رام لچھمن کا سُنا

بے سر و ساماں نظر آتا ہے ہر فردِ بشر
ہو قفس میں جس طرح بلبل کوئی بے بال و پر

ہیں وطن کی شامِ غم سے دُور انوارِ سحر
حل ہو مشکل کس طرح وقفِ تحیّر ہے نظر

انتہا اب ہو چکی الکمل غم و آلام کی
دے رہی ہے رام کی خلقت دہائی رام کی

سوامی رام تیرتھ

جس کے دل میں موجزن تھا بحرِ بے پایانِ عشق
کھیل تھا جس کے لئے ہر موجۂ طوفانِ عشق
جس کی ہستی تھی ازل سے حاملِ عرفانِ عشق
جس کا تھا ہر اِک نفس پروردۂ دامانِ عشق
لمحہ لمحہ جس کا پابندِ خیالِ یار تھا
آہ۔ سوامی رام تیرتھ رام کا اوتار تھا
حسنِ عالمگیر رقصاں تھا نظر کے سامنے
جلوۂ وحدت نمایاں تھا نظر کے سامنے
نیرِ کثرت درخشاں تھا نظر کے سامنے
عارضِ دلدار عریاں تھا نظر کے سامنے
جاگزیں چشمِ تصوّر میں کچھ ایسا نور تھا
دامنِ دل میں سمٹ آیا فرازِ طور تھا

جس کو حاصل تھا اک عالی ظرف وہ میخوار تھا
بزمِ ساقی میں جو بدمستی میں بھی ہشیار تھا
مالکِ حسنِ عمل تھا صاحبِ کردار تھا
کیا نگاہِ شوق تھی کیا جذبۂ بیدار تھا

اپنی دھن میں جا رہا تھا اپنی منزل کیطرف
موج تھی اِک جو کبھی پلٹی نہ ساحل کیطرف
داستانِ دل نئے انداز میں کہتا ہوا
جان و دل پہ ہر طرح کی مشکلیں سہتا ہوا
دُور تھا سنسار سے سنسار میں رہتا ہوا
جا ملا دریا میں آبِ گنگ میں بہتا ہوا
نُور میں مل کر سراپا نورُ ہو کر رہ گیا
طُور میں ایسا سمایا طُور ہو کر رہ گیا

رام کہاں ہے

رام ہر ذرّہ میں ہر رنگ میں ہر روپ میں ہے
ظلمت و نور میں ہے چھاؤں میں ہے دھوپ میں ہے
بحر و بر دشت و جبل سینۂ کہسار میں ہے
خس میں ہے خار میں ہے گل میں ہے گلزار میں ہے
دیدہ و دل میں ہے مستور رگِ جان میں ہے
ہر طرف جلوہ فگن عالم امکاں میں ہے
پریم کے گیت میں ہے پریت میں ہے پیار میں ہے
نے میں ہے لے میں ہے ہر ساز کی جھنکار میں ہے
کہکشاں میں ہے ضیائے مہ و خورشید میں ہے
ہر تمنا میں، ہر ارماں میں، ہر اُمید میں ہے
عشقِ کامل میں ہے وہ حُسن کی تنویر میں ہے
رنگِ تصویر میں آئینۂ تصویر میں ہے

دل کے ناؤں میں ہے مظلوم کی آہوں میں ہے
اپنے بھگتوں میں ہے بھگتوں کی نگاہوں میں ہے

جلوہ افروز وہ یوں دیدۂ عرفاں میں ہے
شمع جیسے کہ ضیا بار شبستاں میں ہے

نور بن کر وہ نہاں دیدۂ بے نور میں ہے
وہی مختار دلِ اکملؔ مجبور میں ہے

بھگوان شوشنکر

وہ بخشا صانعِ قدرت نے تجھکو روپ لاثانی
کہ تابندہ ہے پیشانی میں ہر دم ماہِ نورانی
جٹاؤں سے ہے ہر دم بہہ رہی گنگا جھا دانی
یہ ہے اک سو دلیلوں کی دلیلِ پاک دامانی
زمانے بھر میں ہے مشہور تیری خندہ پیشانی
جو تجھ سے لو لگا بیٹھا اُسے پھر کیا پریشانی
نہیں ہے دیوتا کوئی حقیقت آشنا تجھ سا
ہے سربستہ سمادھی سے تری ہر رازِ پنہانی
نہیں تجھ سا دو عالم میں جھا یوگی نظر آتا
بیاں تجھ کو کرے ہے کیا مجالِ عقلِ انسانی
زمانے بھر میں ہے مشہور تو اے بھولے بھنڈاری
عیاں ہے دہر پہ تیری سخاوت کی فراوانی

لباسِ فقر میں اے محورِ کیلاش کے مالک
شہنشاہوں کی تیرے سامنے ہے آبرو پانی
تری بھگتی بذاتِ خود ہے صد وجہِ سکونِ دل
ترے بھگتوں کو پھر کیونکر ہو دُنیا کی پریشانی
ہم اپنے دردِ دل کا ماجرا تجھ سے کہیں کیونکر
لب ساکت ہے اپنا ترجمانِ دردِ پنہانی
سرِ منزل پہنچکر ہم بھٹک جاتے ہیں منزل سے
ہمارے حال پر بھی دیوتا کچھ لطفِ یزدانی
ہم اکمل معتقد ہو کر دُعا مانگیں جو شنکر سے
بدل سکتی ہے صبحِ آشیاں سے شامِ زندانی

جہاں میں رازِ حقیقت کا رازداں تو تھا
نکاتِ معرفتِ حق کا نغمہ خواں تو تھا
رموزِ عشق کا اک بحرِ بیکراں تو تھا
تھی جس میں لاکھ بہاریں وہ گلستاں تو تھا

ترے کلام نے عالم کو روشنی بخشی
نگاہِ دیدۂ آدم کو روشنی بخشی

کہاں وہ نغمۂ نے وہ ترا پیام کہاں
کہاں وہ بادۂ عرفاں وہ دورِ جام کہاں
وہ بارشِ مئے دستی کا انصرام کہاں
نشیلی صبح کہاں کیف بار شام کہاں

ترا کرم ہو تو پھر شادمانیاں آئیں
پھر ایک بار وطن پر جوانیاں آئیں

شیرِ پنجاب لالہ لاجپت رائے

شیرِ پنجاب لاجپت رائے
کیوں نہ رہ رہ کے تیری یاد آئے

نیرِ آسمانِ آزادی
ہاتھ میں تھا نشانِ آزادی

رازِ ہستی بتا دیا تو نے
ہم کو جینا سکھا دیا تو نے

اس طرح کون جان دیتا ہے
کون دُکھ خود ہی مول لیتا ہے

لاج تو لاجپت نے رکھی ہے
مردِ اعلیٰ صفت نے رکھی ہے

دل دہلتا تھا کج کلاہوں کا
تھا غضب خم تری نگاہوں کا

جس کو تھا ناز تیری ہستی پر
فخر تھا شانِ سرپرستی پر

تیرا پنجاب ہو چکا ٹکڑے
وہ ترا خواب ہو چکا ٹکڑے

اور ابھی انتشار باقی ہے
کچھ دلوں میں غبار باقی ہے

ہائے اس زندگی کو کیا کہیے
وائے قسمت کسی کو کیا کہیے

پیغامِ حسینؑ

(رباعیات)

آئینۂ حق کی آب پیغامِ حسینؑ
صورت گرِ انقلاب پیغامِ حسینؑ
ہر ظلم کی ظلمت کو مٹانے والا
انصاف کا آفتاب پیغامِ حسینؑ

حسنِ رخِ اسلام ہے پیغامِ حسینؑ
رہبرِ اقوام ہے پیغامِ حسینؑ
اللہ کے پیغام کو سننے والو
اللہ کا پیغام ہے پیغامِ حسینؑ

غارت گرِ الحاد ہے پیغامِ حسینؑ
ہاں دشمنِ بیداد ہے پیغامِ حسینؑ
ہے واقفِ رازِ سربلندی اکمل
وہ قوم جسے یاد ہے پیغامِ حسینؑ

نعت

کیا شان ہے جنابِ رسالت مآب کی
نظریں جھکی ہوئی ہیں مہ و آفتاب کی

بخشا کلامِ پاک سے رنگِ حیاتِ نو
تعلیم کہہ رہی ہے مقدّس کتاب کی

مذہب کو زندگی کے عمل سے ملا دیا
ممنونِ التفات ہے اُمّت جناب کی

ہاں چشمۂ مروت و الطاف دیکھنا
جائے نہ آبرو مری چشم پُر آب کی

قرآنِ پاک اس کی صداقت پہ ہے گواہ
تھی کن بلندیوں پہ رسائی جناب کی

مرہونِ لطف صرف مسلمان ہی نہیں
منّت کشِ کرم ہے خدائی جناب کی

میرے بھی حالِ زار پہ ہو اِک نگاہِ لطف
بگڑی بنانے والے جہانِ خراب کی

ہو جس کے دستِ شوق میں دامن جناب کا
کیا اس کو فکر پرسشِ یوم الحساب کی

اکملؔ کہیں مقامِ ادب ہاتھ سے نہ جائے
توصیف لکھ رہے ہو رسالت مآب کی

گورو نانک

تو نے توحید کا عالم کو دیا تھا پیغام
مئے عرفاں کا زمانہ کو پلایا تھا جام
تو سمجھتا تھا دو عالم کی حقیقت کیا ہے
عقدۂ ہستیٔ آدم کی حقیقت کیا ہے
تھا نگاہوں میں تری دیر و حرم کا نقشہ
منظرِ حق تھا تجھے روئے صنم کا نقشہ
تیری ہستی تھی جسے پریم تھا دنیا بھر سے
جیسے آفاق پہ برسات کی بدلی برسے
عین الہام تھی تعلیم تری عالم کو
خاص پیغام تھی تعلیم تری عالم کو
جاگزیں تھی ترے سینے میں وطن کی اُلفت
جس طرح ہوتی ہے بلبل کو چمن کی اُلفت

تیرے دم ہی سے تھا اقبال ہمارا چمکا
کشورِ ہند کی قسمت کا ستارا چمکا

تو غمِ کشمکشِ زیست سے بیگانہ تھا
مئے عرفاں کا ترے ہاتھ میں پیمانہ تھا

نکتہ رس تھی وہ ترے حسنِ تخیّل کی ادا
جس نے عریاں کیے اسرارِ حقیقت کیا کیا

تیری نظروں میں بلندی تھی نہ پستی کوئی
تیرے نزدیک تھی عالم کی نہ ہستی کوئی

بربطِ دل سے ترے جو بھی صدا آتی تھی
پردۂ سازِ حقیقت کی خبر لاتی تھی

اپنا محبوب ہر اک لمحہ تجھے یاد رہا
تو ہر اک قیدِ غم و یاس سے آزاد رہا

جو سبق تو نے پڑھایا تھا وہ ہم بھول گئے
تو نے رستہ جو دکھایا تھا وہ ہم بھول گئے

پھر وہی مذہب و ملّت کی ہے بیکار یہاں
زندگی مذہبی جھگڑوں سے ہے بیزار یہاں
آکہ پھر ہند غم و یاس کی تصویر بنا
اس سیہ خانے کی بگڑی ہوئی تقدیر بنا
پھر وہی گیت محبت کا سُنا دے ہم کو
پھر مئے عشق سے سرشار بنا دے ہم کو
پھر وہی لطف کہ تا حشر رہے شاد وطن
پھر ہو قید غم و آلام سے آزاد وطن

ڈاکٹر اقبال کی یادمیں

اے سپہرِ نکتہ دانی کے منوّر آفتاب
تیرا اس عالم میں پیدا ہو نہیں سکتا جواب

اُف وہ اندازِ بیانِ داستانِ غم ترا
آج بھی کرتی ہے ہر بزمِ سخن ماتم ترا

تُو نے اسرارِ حقیقت رکھ دیئے ہیں کھولکر
مرحبا کیا چیز تھی تیری حکیمانہ نظر

دہر میں تیرے تخیّل کی عجب پرواز تھی
گونجتی ہر سمت تیری فکر کی آواز تھی

تجھ کو بخشے تھے خدا نے دیدہ و دلِ حق شناس
تیری نظروں نے اڑا رکھے تھے باطل کے حواس

تجھ کو بے پردہ نظر آئے رموزِ کائنات
سیکھ لے تجھ سے کوئی عشق و محبت کے نکات

تو نے خود داری کا دنیا کو پڑھایا تھا سبق
تو نے سمجھایا کہ ہر انسان کو ہے جینے کا حق

زندگی کا فلسفہ تو نے بتایا دہر کو
بالیقیں اے نکتہ ور تو نے جگایا دہر کو

ہے ترے نغموں سے صحنِ گلستاں گونجا ہوا
گلستاں کیا، ہے زمین و آسماں گونجا ہوا

تو جہاں میں ایک ہی مستِ مئے الہام تھا
پُر مئے الہام سے تیرے سخن کا جام تھا

تیرے ہاتھوں وا ہوا میخانۂ رازِ حیات
تو وہ تھا جرعہ کشِ پیمانۂ رازِ حیات

بلبلِ ہندوستاں تو کس لئے خاموش ہے
تیری چُپ سے بحرِ شعریت کا ٹھنڈا جوش ہے

سرنگوں ہے پرچم شعر و سخن تیرے بغیر
سرد ہیں جذباتِ اہلِ انجمن تیرے بغیر

تو کہاں ہے ناخدائے کشتی علم وہنر

ڈھونڈتی پھرتی ہے تجھکو اک زمانے کی نظ

آ دیارِ ہند کی پھر سمت اے اقبال آ

آ حکیم و چارہ سازِ ملّتِ پامال آ

قطعات

پنڈت جواہر لال نہرو

باغِ عالم میں بہت گُل ہیں گُلِ تر ایک ہے
دیدنی اس منظرِ عالم میں منظر ایک ہے
یہ حقیقت ہے جہاں والے سمجھتے ہیں جسے
سنگ ریزے ہیں بہت لیکن جواہر ایک ہے

زندگی اُن کی کا مگار نہیں
ان کی تقدیر میں بہار نہیں
وہ رہیں گے خزاں نصیب اکملؔ
جن کو اپنے وطن سے پیار نہیں

کوہساروں سے کھیل سکتے ہیں
تیز دھاروں سے کھیل سکتے ہیں
ہم سجا کر رہیں گے فرشِ وطن
چاند تاروں سے کھیل سکتے ہیں

ہمہ تن آگہی رہے بن کر
سر بسر عاجزی رہے بن کر
زندگی کا مزا ہے جب اکملؔ
آدمی آدمی رہے بن کر

نیکیاں نیکوں کی رہ جاتی ہیں بن کر یادگار
اور بدوں کو کوستی رہتی ہے دُنیا بار بار
یاد تو دونوں ہی رہتے ہیں زمانے کو مگر
اک خزاں کے روپ میں اک صورتِ فصلِ بہار

نہ رنگ و بو ہے نہ تازگی ہے عجیب عالم بہار کا ہے
نہ پوچھ اہلِ چمن کی حالت بہار میں غم بہار کا ہے
نہ جانے یہ کیسے گُل کھلے ہیں کلی ہے نامحرمِ تبسم
بہار کیا ہے یہ درحقیقت چمن میں ماتم بہار کا ہے

رُباعیات

لب خشک ہیں چہرہ ہے اُداس اے ساقی
ہے اک ساغر کی تجھ سے آس اے ساقی
ہر چند سرشکوں سے بجھاتا ہوں میں
بجھتی نہیں لیکن مری پیاس اے ساقی

کیا ہوں گا کبھی نہ سیر کام اے ساقی
واللہ نہیں مے مجھ پر حرام اے ساقی
حاصل ہو قیودِ غمِ دوراں سے نجات
لا بادۂ گل رنگ کا جام اے ساقی

عالم کی فضا ہے خشمناک اے ساقی
ظلمت نے بٹھا رکھی ہے دھاک اے ساقی
تجھ کو مئے رنگیں کی تجلّی کی قسم
کر دہر کو تیرگی سے پاک اے ساقی

دیوانوں کے حالات سمجھنے والا
مفہوم اشارات سمجھنے والا
میں کس سے کہوں حالِ غمِ دل اے دوست
ہے کون مری بات سمجھنے والا

دُنیا میں مصیبت کے سوا کچھ بھی نہیں
یاس و غم و حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ فیصلۂ اہلِ نظر ہے اکمل
کچھ ہے تو محبّت کے سوا کچھ بھی نہیں

لمحاتِ پریشاں سے گذر لے پہلے
سوزِ غمِ پنہاں سے گذر لے پہلے
آجائے گا خود پیشِ نظر ساحل بھی
اُمڈے ہوئے طوفاں سے گذر لے پہلے

حالاتِ زمانہ سے پریشاں ہوں میں
اس عالمِ ہستی سے گریزاں ہوں میں
روتا ہوں میں اپنے غمِ دل کا رونا
دُنیا یہ سمجھتی ہے غزلخواں ہوں میں

بن بن کے بگڑ جاتی ہے تقدیر مری
بے کار بہر کیف ہے تدبیر مری
بے گانوں کا کیا کہنا الٰہی توبہ
اپنے نہیں پہچانتے تصویر مری

عرفانِ محبت کوئی کیوں کر سمجھے
اسرارِ حقیقت کوئی کیوں کر سمجھے
خود جس کو سمجھ کر کوئی سمجھا نہ سکا
اُس عشق کی لذّت کوئی کیوں کر سمجھے

انسان پریشاں ہے بدستور ابھی
قسمت سے بہر طور ہے مجبور ابھی
وہ دور کہ کہتے ہیں جسے دورِ نشاط
ہے دُور بہت دُور بہت دُور ابھی

ساحل ہی سے اندازۂ طوفاں تو کرو
ایسے میں کوئی زیست کا ساماں تو کرو
جس قوم نے مختار بنایا ہے تمھیں
اُس قوم کی مشکلوں کو آساں تو کرو

ہے مہر و محبت کا پیام آزادی
ہے عیش و مسرت کی امام آزادی
پیتے ہی جسے دیدہ و دل جھوم اُٹھیں
وہ بادۂ سرجوش کا جام آزادی

ساون کی گھٹاؤں کی پھُوار آزادی
ہے آبِ بقا کی آبشار آزادی
جس گلشنِ ہستی کے ہیں کانٹے بھی عزیز
اس گلشنِ ہستی کی بہار آزادی




کیا رنگ پہ ہے حالِ پریشاں اپنا
صد چاک ہے اب جیب و گریباں اپنا
میں میکدۂ عشق میں ہوں جام بدست
تو کام کرائے گردشِ دوراں اپنا

